ایک دلچسپ معاشرتی ناول

نقاب

عفت موہانی

حقوق اشاعت دائمی طور پر بحق
نسیم بکڈپو لکھنؤ
محفوظ ہیں

ناشر

نسیم بک ڈپو - ۲۵ - لاٹوش روڈ لکھنؤ

آفس :- ۴۴۵۵۹
فون: رہائش :- ۶۵۳۳۴

ناشر: نسیم امروہوی بار اول جنوری سنہ ۸۴ء پرنٹر :- نامی پریس لکھنؤ

اُن سب کو آنے والی ساعت کا خوب اچھی طرح پتہ تھا۔ ہشام تو سارے کام چھوڑ چھاڑ کر چچا میاں کے ہاں بھاگ آیا اور اپنے چھپنے کے لئے چوہے کا بِل تلاش کر رہا تھا!۔ جو شرارت اس نے کی تھی۔ اور اس شرارت میں اپنے دوستوں کو بھی شامل کر لیا تھا۔ وہ ایسی نہ تھی کہ بزرگوں سے ٹھنڈے پیٹوں برداشت ہوتی!۔ اسے تو پکا یقین تھا۔ جب تک سیر بھر دودھ اور آدھ سیر گھی نہ پی لے گا۔ پیٹھ چوٹ اور چھیوں کی خاطر خواہ آؤبھگت نہ کر سکے گی!۔ مگر دودھ اور دہی کا تذکرہ کیا جبکہ سارا قصہ سُن کر امی نے دوپہر کا کھانا ہی نہ دیا۔ بلکہ چہرہ سرخ کر کے بولیں۔

" دفع ہو جا یا جی سامنے سے۔ ابھی کم بختیوں بھر کا رہ گیا ہے۔ نگوڑا کوڑی کام کا نہیں۔ جانے کیا کر کے جئے گا۔ بس شرارتیں کرنے کو دے دو۔!"

پھر اس سے پہلے کہ وہ بلی بھگانے کی خاص لکڑی ہاتھ میں لیتیں۔ وہ بھاگ گیا اور چچا میاں کے ہاں آ کے پناہ لی تھی!:

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ڈیوڑھی میں پھوپھا ابّا کے زور زور سے چنگھاڑنے کی آواز سُنائی دی:

" کوئی حد ہے۔ وہ دہاڑ رہے تھے۔ حسب عادت بے جوڑ فقروں میں: ماں باپ نے دُلار کر کر کے لونڈے کو چھت پر چڑھا دیا ہے۔ (بھول گئے کہ "سر" پر کہنا چاہیئے تھا۔) میں کہتا ہوں۔ بنّن میاں کہاں ہیں۔ اب دیکھیں

اپنے لاڈلے بھتیجے کے کرتوت۔ بزرگوں کی شان میں یہ بے ادبی۔ ایسی سخت گستاخی کچھ پتہ ہے کہ یہ کمبخت تصویر سارے خاندان میں گھومے گی۔ ساری خلقت اسے دیکھے گی۔ اور ہنسے گی۔ لاحول ولاقوۃ۔ اچھا! ہے کہاں وہ بدمعاش "

دالان میں سارا گھر اکٹھا ہو گیا! "

پھوپھا ابا گرجتے برستے اندر آئے۔ حسب معمول کھادی کا جھابر جھبول پاجامہ اور گھٹنوں سے نیچی قمیص پہنے۔! سر پہ دوپلی ٹوپی اور ناک پر بیضوی چشمہ۔ جو" اضافۂ وقار" کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ ویسے وہ عموماً چشمے کے اوپر سے دیکھتے تھے! "

کیا ہوا "چچی اماں نے پوچھا"

ثریا پا" (بڑی آپا کا مخفف تھا) "یہ پوچھئے کہ کیا نہیں ہوا ملاحظہ فرمائیے۔ صاحبزادے صاحب کے کرتوت۔ واللہ ساری خلقت کے سامنے تماشہ بنا کر رکھ دیا۔ مجھ میں نہیں آتا کہ کیا سزا دوں۔ ناخلف کہیں کا۔ یہ سب آپ حضرات کے بیجا لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔ یہ دیکھئے۔ اس تصویر کو ملاحظہ فرمایئے! "

انہوں نے ایک سفید لفافہ بڑے طیش میں چچی اماں کے سامنے پھینک دیا اور خود کرسی پہ بیٹھ کر مارے طیش کے زور زور سے پاؤں ہلانے لگے! "

سب کی طرف سے رُخ بھی پھیر لیا"

اللہ۔ آ گئیں بھائی جان کی شادی کی تصویریں" لڑکیاں لفافہ پر جھک پڑیں۔ چچی اماں نے تصویریں نکالیں۔ پہلی تصویر پہ نظر پڑی تھی کہ انھیں یکبارگی ہنسی کا اچھو لگ گیا! "

لڑکیاں اور لڑکے بھی ہنسی کے مارے گرم گرم پڑے "

تصویر میں یوں تو دولہا دلہن اور دوسرے لوگ نمایاں تھے ہی۔ لیکن سب سے نمایاں پھوپھا ابّا تھے۔ پہلی صف میں اور بڑی شان سے دولہا دلہن کے بیچ میں متمکن تھے۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ مگر اُن کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پھٹا پُرانا جوتا تھا۔ جیسے وہ اس شان سے لئے بیٹھے تھے کہ کیا کوئی جنرل کرنل بندوق لے کے بیٹھے گا۔ ان کے چہرے پہ فخریہ مسکراہٹ تھی۔ جس نے اور سب کی ایسی تیسی کر کے رکھ دی؟

اے بھیّا یہ جوتا! ؛ چچی اماں ہنسی کے مارے آگے کچھ نہ بول سکیں ؛

جی ہاں۔ ! ؛ پھوپھا ابّا نہایت غصّے سے بولے ؛ ہاتھ میں پکڑانے کے بجائے یہ زیادہ اچھا ہوتا کہ میرے سر پہ دے مارا جاتا۔ اب آئیں میرے سامنے بچن میاں۔ اور تعریف کریں بھتیجے کی ! ؛

مگر یہ آپ نے ہاتھ میں پکڑ ہی کیوں لیا۔ ! ؛ پھوپھی اماں نے کہا اور پھر آنچل لبوں پہ رکھ لیا ؛

" مجھے دیوانے چوہے نے کاٹا تھا کہ پکڑ لیا ؛ وہ بیوی کی بات پہ اور غصّہ ہوئے ؛ ارے مجھے کیا پتہ تھا۔ شادی بیاہ میں کیا کیا رسمیں ہوتی ہیں۔ میں کیا جانوں۔ وہی باجی ناخلف تصویر کھنچوانے وقت میرے پاس آیا اور پوچھا۔ پھوپھا ابّا کیا آپ بھی دولہا دلہن کے ساتھ تصویر کھنچوانے کے لئے بیٹھ رہے ہیں۔ میں نے کہا بیٹا مجبور کر رہے ہیں یہ لوگ۔ کہنے لگا کہ جی ہاں ایک بزرگ ساتھ میں ہو تو دولہا دلہن کے نظر نہیں لگتی۔ اور پھر یہ منحوس جوتا میرے ہاتھ میں پکڑا کر بولا کہ ہمارے ہاں کی رسم ہے۔ بزرگ ہاتھ میں جوتا لیکر تصویر کھنچوائیں تو دولہا دلہن پہ کبھی آسیب نہیں آتا۔

لاحول ولا قوۃ۔ میں اس نالائق کی باتوں میں آ گیا۔ اب یہ تو بھائی چھکن نے

کچھ ضد کرتا تب ماں جھنجھلا کر اسے پھوپھی کے پاس ہنکا دیتی۔ اپنی آمدنی کا زیادہ تر حصّہ پھوپھی اپنے بھائی کے بچوں پر اُٹھا دیتیں۔ سب ایک دل ایک جان تھے۔ محبّت ان سب پر سایہ فگن تھی!

سب سے زیادہ پھوپھی سے ہشام اور سائرہ مانوس تھے۔ بچپن ہی سے ان کے پاس رہتے آئے تھے۔ ہشام منجھلے بھائی کا لڑکا تھا۔ اور سائرہ چچا ابا کی سب سے چھوٹی لڑکی۔! اب وہ اسکول کی تعلیم ختم کر کے کالج کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھ رہی تھی۔ مگر پھوپھی اسے سترہ اٹھارہ سال کی نوخیز لڑکی کے بجائے وہی چار پانچ سال کی بچی سمجھتی تھیں۔ جو اپنی پلیٹ میں روٹی اور شکر رکھے پھوپھی کے پیچھے پیچھے پھرا کرتی تھی کہ اپنے ہاتھ سے کھلائیے۔!

اب بھی سائرہ کا یہ حال تھا کہ پھوپھی کا دل رکھنے کے لئے وہ ربر بینڈ انگلی میں پہنے پھوپھی کے پیچھے پھرتی۔ بال بنا دیجئے۔ اسے پتہ تھا۔ پھوپھی کا دل اولاد کے لئے ترستا ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی بات ایسی ہو جائے جس سے پھوپھی کا نازک سا حساس دکھیارا دل ٹوٹ جائے کہ یہ ہماری اولاد نہیں۔ اس کی ایک ایک ادا پر پھوپھی وارے صدقے ہوا کرتیں۔ اور سائرہ کی امی نے کبھی بھول کر بھی پھوپھی بھتیجی کے ہر اسم پر نکتہ چینی یا تنقید نہ کی!

یہی حال ہشام کا تھا۔ وہ اپنے پھوپھا سے چمٹا رہتا۔ انہیں بنانا بھی تھا۔ ان سے شرارتیں کرتا۔ لیکن کیا مجال کہ ان کی شان میں گستاخی یا بدتمیزی کی ہو۔ پھوپھا ابا اس کی شرارت کا نشانہ بن کر ہنستے تھے۔ اسے بُرا بھلا کہتے تھے۔ مگر دونوں ایسے پکے دوست تھے جیسے ہم عمر ساتھی ہوں۔! وہ انہیں اول جلول اشعار سناتا۔ وہ جھوم جھوم کر داد دیتے۔ کبھی انہیں فلم کی واہیات سی کہانی سناتا۔ اور وہ اتنی عقیدت اور توجہ سے سنتے جیسے کوئی سعادتمند

شاگرد اپنے قابل احترام استاد کا ضروری لیکچر سن رہا ہو۔ جس پر اس کے مستقبل کا انحصار ہو!٭

ان لوگوں کی محبت اور یکجائی کا ایک اثر یہ ہوا کہ ناقابل احساس حد تک ہشام اور سارہ قریب آ گئے۔ ان کی قربت شیر و شکر کی نہیں۔ آگ اور تیل کی تھی۔ ایک کی صورت دیکھی کہ دوسرا بھڑکا۔ ہشام تیز طرار اور بے حد شریر تھا۔ سارہ اتنی ہی غصہ ور اور جلدی سے پھٹ پڑنے والی۔ سارہ کو یہ فخر و غرور تھا کہ وہ انٹرنس کر رہی تھی۔ جبکہ ماں باپ اور پھوپھا پھوپھی کے بے جا دلار نے ہشام کو صرف ایک کوڑی کا کر کے رکھ دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ پڑھنے لکھنے سے بے انتہا جان چراتا تھا۔ بلکہ وہ سارہ کی نظروں میں قطعی آوارہ بھی تھا۔ دن بھر جو لڑکا گھر سے غائب رہا کرے۔ بڑوں کو جھانسے دے دے کر پیسے وصول کیا کرے۔ جس کے درجنوں غنڈے لڑکے دوست ہوں اور دروازے پہ ہر وقت اس کے نام کی پکار پڑی رہے۔ وہ آخر خود بھی غنڈہ جاہل اور آوارہ نہ ہوا تو پھر کیا اسے شریف مہذب اور تعلیم یافتہ کہا جائے گا؟

بڑی حیرت تو سارہ کو یہ تھی کہ آخر چھوٹے چچا اسے مار پیٹ کر پڑھاتے کیوں نہیں؟ ایک تئیس چوبیس برس کا لڑکا تو آسانی سے ایم۔ اے کر چکتا ہے۔ یہاں صاحبزادے نے الف بے بھی نہیں سیکھی۔ وہ اسے بے حد حقیر اور کم رتبہ سمجھتی تھی۔!

دالان میں چائے کا دور چل رہا تھا!٭

بڑی باجی اور نئی نویلی بھابی جو باجی ہی کی گہری دوست تھیں۔ اور انہی نے بیچ میں پڑ کے بھائی جان کی شادی کرا دی تھی۔ بڑے کمرے میں تھیں۔

ہشام الماری کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ سامرہ بھی اپنی بھابی کے پہلو سے لگی بیٹھی ان کے جسم سے اٹھنے والی حسین خوشبوؤں کو سانس میں بھر رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ لڑکی دلہن بن کر کیوں اتنی مکمل لگتی ہے کہ دل چاہتا ہے بس اسے سینہ چیر کر دل کی دھڑکن بنا لو۔ پلکوں پہ بٹھا لو۔ اسی مارے تو نگوڑے لڑکے اپنی نئی نویلی دلہن پہ صدقے قربان جاتے ہیں اور ماں باپ کو پیچھے پھینک دیتے ہیں۔"

آج تمہارا قتل عام ضرور ہے۔" بڑی باجی نے چہرے پر بھونچال پیدا کر کے ہشام سے کہا۔" یہاں کیوں چھپے ہو۔ ہمت ہے تو ڈیڈی اور چھوٹے چچا کے سامنے جاؤ۔! بڑا برا مذاق کیا تم نے پھوپھا ابا سے۔"

ڈرتا ڈرتا ہشام الماری کے پٹ کے پیچھے سے نکلا اور بڑی باجی کے پاس آ بیٹھا۔ سامرہ کا منہ بن گیا۔ اسے تو ہشام کی ہر حرکت سے جلن لگتی تھی۔ نری بناوٹی اور فلمی حرکتیں کرتا تھا۔! اگر وہ اس سے بڑی ہوتی تو اس کا خیال تھا کہ اسے چھ سات کرارے طمانچوں میں درست کر دیتی۔ یہ بزرگوں کی ڈھیل کا نتیجہ ہی تو تھا کہ وہ بے نتھا بیل بنا پھرتا تھا۔ وار کے فقرے کس کے سامرہ کو رلا رلا دیتا تھا۔ لیکن کیا مجال کہ کوئی اس کی گوشمالی تو کر دے۔ اب لڑکا سر نہ چڑھے گا تو پھر کیا کرے گا؟"

آپ بھی مجھی پہ اعنڈ پڑیں۔" ہشام نے خاصی بے تمیزی سے جواب دیا۔" جناب اس بڑی حرکت پر مجھے آپ کے شوہر نامدار ہی نے ابھارا تھا۔ کہنے لگے تھے کہ میری شادی پر تمہاری بہنوں نے مرچ اور کنکر بڑا پان کھلایا تھا۔ اب میں بھی بدلہ لوں گا۔ ورنہ آپ جانتی ہیں کہ میں کس قدر شریف بچہ ہوں!"

ادھر ہٹو۔ کلیجے میں کہاں گھسے آ رہے ہو۔ چھوڑے کہیں کے۔" بڑی باجی نے

جھڑکی دی۔ وہ اُدھر سے اٹھا اور بھابی سے چپک کر بیٹھ گیا وہ بھی جز بز ہوئیں۔

"ہائے شامی۔ میں یونہی گرمی کے مارے بوکھلائی جا رہی ہوں۔ تم آخر اُدھر کرسی پر کیوں نہیں بیٹھ جاتے؟"

"اُدھر کچھ مرے چوہوں کی سی بدبو آ رہی ہے بھابی" وہ سامرہ کو کنکھیوں سے دیکھ کر بولا۔ حالانکہ کمرے میں خوشبوؤں کا طوفان سا مچل رہا تھا۔ سامرہ کے حسبِ عادت آگ لگ گئی۔

"آپ خود مرے چوہے"

کمال ہے" وہ ہنسا "کسی کا نام نہ لو تب بھی لوگ گلے پڑنے کو تیار رہتے ہیں۔ ایسی ڈھٹائی کو تو میرا دور سے سلام۔!"

ہشام" بھابی دبی آواز میں گرجیں"

یس سر؟"

"کچھ تو اپنی عمر کا لحاظ کیا کرو۔ وہ تم سے بہت چھوٹی ہے۔ شرمایا ہی کرو۔ برابر سے جواب سنتے ہو!"

چھوٹی ہے تو جھولے میں لٹا کے منہ میں چسنی دے دیجئے" وہ بڑی طرح جھلایا "اٹھارہ سال کی بھینس" پہلے زمانے میں تو اللہ رکھے اٹھارہ سال کی عورت آٹھ بچوں کی ماں ہو جاتی تھی۔ اس گھر میں یہ ابھی چھوٹی ہیں"

سامرہ نے میز پر سے پلاسٹک کا گلدان اٹھایا اور اس پر کھینچ مارا۔ اس نے بڑے اسٹائل سے گلدان کیچ کیا اور میز پہ واپس رکھ دیا۔ جیسے بالکل بُرا نہ مانا ہو"

"یا خدا تم اتنے دقیانوس کب سے ہو گئے ہو" بڑی باجی نے حیرت سے کہا۔ "پرانے زمانے کو تم نے کب دیکھا ہے"

"میں کیا جانوں؟" اسد نے بُرا سا منہ بنایا۔ "یہی محترمہ چھنولی ایک دن کہہ رہی تھیں کہ مالن کی بیٹی پھندیا اٹھارہ برس کی ہے۔ اس کا ایک بچہ بھی ہے اور یہاں ہمارے بیاہ کا کوئی سامان نہیں!"

"جھوٹے کمینے، اللہ کرے غارت ہو جاؤ تم" ساجرہ کو رونا آگیا۔ "کب کہا تھا میں نے!؟"

"اچھا بے شرم بھائی اب تم یہاں سے منہ کالا کرو!" بھابی بولیں۔ "یہ باتیں کوئی بڑا بزرگ سُن لے تو یہی کہے کہ اچھا ہم نے تم کو شتر بے مہار بنایا ہے۔ چھپ کے ساری بکواس سُن لیتے ہیں۔ باہر جاؤ تاکہ ڈیڈی کھال اُدھیڑیں!"

"آپ اپنے خسر محترم کی شان میں گستاخی فرما رہی ہیں" ہشام نے انھیں نصیحت کی۔ "کھال اُدھیڑنا ان کا کام نہیں۔ کیا وہ قصائی۔۔!"

"اور تمہارے ساتھی شیطان کہاں فنا ہو گئے" بھابی نے اس کے گال پر طمانچہ کھینچ کر دانت پیسے۔ "معاف تو ہرگز نہ کیے جاؤ گے۔ ہنہ! بیچارے بھولے بھالے پھوپھا ابا کو جوتا پکڑا دیا۔ بدتمیز کہیں کے۔ اور وہ سب کہاں گئے جو اس شرارت میں تمہارے شریک تھے؟"

"ارے بھابی" وہ ہنسنے لگا۔ "پھوپھا ابا کی آواز کا صور سنتے ہی سب کا یہ حال ہوا کہ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ اب آپ ان کی گرد بھی نہیں پا سکتیں۔ یہ تو میں ہی بے چارہ ــــ بقول اقبال صاحب ؎

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

بڑی باجی اور بھابی نے سخت مکدر ہو کر منہ بنائے۔ ساجرہ تو آگ بگولہ ہی ہو گئی۔

یہی نتیجہ ہوتا ہے جہالت کا۔" وہ جل کر بولی۔ "الف کا نام گدھا بھی نہیں جانتے۔ پھر اقبال اور غالب کے نام کیوں لیتے ہیں۔ جیسے کہ بے چارے بڑے علامہ ہی تو ہیں۔"

"ہشام۔ خدا کے لئے اب باہر جاؤ۔ ہمارے پاس گھس کر بیٹھتے تم کو ذرا سی شرم بھی نہیں آتی۔!" بڑی باجی بولیں۔

"بہت سی شرم آتی ہے۔!" وہ بولا۔ "مگر جائیں تو جائیں کہاں۔ باہر خواجہ خضر اور حضرت عزرائیل میرا خون پینے کے لئے جو موجود ہیں۔"

بڑی باجی نے اس کا کالر پکڑ کر اسے اٹھایا اور کمرے سے باہر ڈھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔

جتنے حضرات دالان میں موجود تھے۔ ان سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اب وہاں نئے نویلے دولھا میاں یعنی کہ بھائی جان بھی براجمان تھے۔ اسے دیکھ کر ان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بدمعاش ادھر آؤ۔!" چچا میاں نے گھونسہ دکھا کر کہا۔ اس نے تیزی سے قدم بڑھائے۔ اور بھائی جان کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" اس کے والد یعنی چھوٹے چچا نے کہا۔ حالانکہ وہ گرج رہے تھے مگر گرج کا کھوکھلا پن ہشام نے صاف پہچان لیا۔ وہ مسکراہٹ بھی دیکھ لی جو اُن کے لبوں پر دفعتہً آگئی تھی۔

"کیوں بے غنڈے۔ یہ تو نے بڑوں سے مذاق کرنا کب سیکھ لیا ہے۔"

چچا میاں بھی دہاڑے۔ "یاد رکھ۔ ایسی مرمت کردوں گا کہ بھول جائے گا اپنی چوکڑی۔ معافی مانگ ہاتھ جوڑ کے۔ پھوپھا ابا سے۔ چل۔ میں کہہ رہا ہوں لفنگ ۔"

"کیوں۔ بھائی۔" بیچ میں پھوپھا ابا ہکلا کر بولے۔ "مجھ سے کیوں

معافی مانگے بے چارہ۔ کیا کیا ہے اس نے؟" ظاہر تھا کہ کھانے پینے اور ادھر ادھر کی باتوں کے درمیان وہ سب کچھ بھول چکے تھے۔"

"تمہاری بھول پر پتھر پڑیں" چچی اماں نے کہا: "ابھی تو وہ نگوڑی تصویر دیکھ کر ہاتھ ہاتھ بھر اچھل رہے تھے۔ اب دیکھو تو جیسے کچھ یاد نہیں۔ کھڑا ہے یہ پاجی۔ لگاؤ ایک ہاتھ کہ ادھے دار ہو۔"

"ارے واہ۔ بڑے پاپا" وہ گھنی مونچھوں میں ہنسنے لگے "کیوں لگاؤں غریب کے ہاتھ۔ ایسا معصوم بچہ ہے۔ واللہ کہ ایسا محبت والا، شریف اور نیک بچہ میں نے اس کے سوا اور کہیں نہیں دیکھا۔ اور۔ ہاں۔ وہ آپ کیا کہہ رہی تھیں۔ تصویر کیسی۔ کس کی تصویر۔؟ کیا قصہ ہے؟"

"ارے دفعہ کرو اس تصویر کے جھگڑے کو" چھوٹی چچی یعنی کہ ہشام کی ممی سخت ہو کر بولیں: "میرے تو کان پک گئے ہیں۔ وہ کچھ یاد ہی نہیں رکھتے۔ لو۔ اسٹیج ڈرامے کے ڈائلاگ شروع ہو گئے۔ انہی حرکتوں نے تو اس کا اور ناس مار رکھا ہے۔ نکما۔ نکھٹو کہیں کا۔ بس یونہی ڈنڈے بجاتے۔ بدمعاشیاں کرتے اور ہبل کی طرح جگالی کرتے زندگی گزار دے گا۔ نہ پڑھے گا نہ لکھے گا۔ ارے میں کہتی ہوں۔ بڑے پاپا۔ آخر اس موئے کا بیڑہ کہاں لگے گا۔ کیا کر کے جئے گا۔ کل کلاں کو اسے بیٹی کون دیگا؟"

"بیٹی لے کر مجھے کیا کرنا ہے۔ میرے پاس تو کپڑے رکھنے کے لئے اتنی بڑی اسٹیل کی الماری ہے" ہشام نے بسکٹ چباتے ہوئے بڑے بھول پن سے کہا۔"

"میاں! سنجیدگی سے سوچنا ہے تمہیں" بھائی جان نے کہا "اتنے بڑے ہو گئے ہو۔ تم کچھ پڑھا لکھا نہیں۔ اپنے ہمسائے انسپکٹر صاحب کے

لڑکے کی مثال لو۔ تمہارے ہی برابر ہے۔ مگر بی۔ کام کر کے اب ایل۔ ایل۔ بی کا تیسرا سال کر رہا ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم دل پر رکھ لو تو میں ٹیوٹر کا انتظام کر دوں۔ پرائیوٹ طور پر ہی سہی۔ میٹرک پاس کر لو تو پھر جلدی سے کالج کی تعلیم مکمل کر و۔ کیوں؟"

بڈھا طوطا" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ پھر بولا "جی بہت اچھا۔ آپ انتظام کر دیجئے ٹونٹی کا۔ کوشش کروں گا کہ"

"ٹونٹی؟" تین چار زبانوں سے اچانک نکلا۔ "ابھی آپ ہی تو کہہ رہے تھے" اس نے بُرا مانا۔

"میں نے ٹیوٹر کہا تھا" بھائی جان نے جھلا کر کہا "جو ٹیوشن پڑھاتا ہے۔ اسے ٹیوٹر کہتے ہیں۔ سمجھے؟"

"میں نے یہ لفظ پہلے کبھی نہیں سُنا" اس نے حیرت سے کہا۔ "اب سُن لو"

بھائی جان کو اس کی جہالت پر ایک ساتھ غصہ اور ترس آیا۔ یہی حال ہوتا ہے اکلوتے لڑکے کا۔ اگر حد سے بڑھ کر لاڈ پیار کیا جائے۔ غضب ہے خدا کا۔ چوبیس برس کے ہاتھی جیسے موٹے تازے لڑکے کو معمولی لفظ بھی نہیں معلوم۔ پتہ نہیں کیوں چھوٹے چچا نے شروع ہی سے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ ورنہ آج وہ کہاں سے کہاں ہوتا!"

"تمہارے نصیبوں کا اللہ ہی مالک ہے" انہوں نے ایک لمبی سی افسوس زدہ سانس لی۔ اور مارے دکھ کے ایک تلا ہوا کاجو چپکے چپکے چبانے لگے!"

ان کے برخلاف ہشام نے مٹھی بھر کاجوؤں کا پھنکا مار کے گنواروں کی طرح منھ چلاتے ہوئے پوچھا"

" فرنیچر۔ آپ نے نیا خریدا ہے کیا؟"

اور بھائی جان جو عرصے سے ضبط کئے بیٹھے تھے۔ دفعتہً بے قابو ہو گئے۔ اپنے چھوٹے چچا کی طرف مڑ کر بولے " چھوٹے چچا۔ آج مجھے بتائیے کہ آپ نے آخر اسے پڑھایا لکھایا کیوں نہیں؟ اس کی چھوٹی دو بہنیں اچھی خاصی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ ماشاء اللہ اچھے اچھے ڈویژن لاتی ہیں۔ آپ نے لڑکیوں پر توجہ دی۔ اور لڑکے کو یونہی چھوڑ دیا۔ آخر آگے چل کر اسے زندگی گزارنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ بتائیے مجھے۔ یہ کیا کرے گا۔ کیا اسے یونہی پھرنے کے لئے آپ نے آزاد چھوڑ رکھا ہے؟"

" میاں۔ میں کیا کروں" چھوٹے چچا نے ہشام کو غیظ و غضب سے گھورتے ہوئے کہا " اس کے پیچھے سر پھوڑ پھوڑ کر عاجز آگیا ہوں۔ دماغ اس کم بخت کا لوہے کا ہے۔ کوئی بات بھیجے میں نہیں سماتی۔ تم کہو گے آم وہ کہے گا املی تین چار استاد زچ ہو کر بھاگ گئے کہ اس غبی سے ہم سر نہیں مار سکتے۔ بتاؤ۔ میں کیا کرتا۔ آخر چھوڑ دیا بد بخت کو اس کے حال پر۔ جب ہماری نہیں مانتا تو آپ بھگتے گا۔ ٹھیلا ڈھکیلے گا۔ رکشا چلائے گا۔ سر پہ ہاتھ رکھ کر روئے گا۔ لطف تو یہ ہے منصور میاں کہ اماں جان صاحبزادے کو انگلی تک لگانے نہیں دیتیں۔ ادھر میں کچھ بولا کہ اُدھر محترمہ غرا کر مجھ پر چڑھ دوڑیں۔ میں تو تھک گیا۔ ہار گیا۔ اب کوئی علاج تم ہی کرو۔"

" میرا نام بیکار لیتے ہیں آپ " چھوٹی چچی کو طیش آگیا " جب بھی میں نے ہشام کے مستقبل کا تذکرہ کیا۔ آپ نے الٹا مجھے خاموش کر دیا کہ نہ سہی۔ اس کا دماغ پڑھنے میں نہیں جمتا۔ نہ پڑھے۔ بہت سے بہت ہزار بارہ سو سرکاری ملازمت میں ملیں گے۔ نہ ملیں۔ اللہ نے تھوڑی بہت جائداد

دی ہے۔ لڑکیوں کو بیاہنے کے بعد بھی اگر ڈھنگ سے خرچ کرے گا تو ہمیشہ ساتھ دے گی۔۔! مگر مت بتائیے۔ بتائیے آپ نے کہا تھا کہ نہیں!"

کہا تھا اب بھی کہتا ہوں۔" چھوٹے چچا برافروختہ ہو کر بولے۔" جب یہ بالکل جاہل مطلق گودھا ہے تو بہر حال اس کی گزر بسر باپ دادا کی زمین ہی کے ذریعہ ہو گی۔"

اچھا برخوردار!" چچا میاں نے اپنے چھوٹے بھائی بھاوج کو جھگڑا کرنے سے روک کر کہا۔" کان دے کر سنو کہ۔ خبردار اب تم رات کے دس دس بجے تک باہر سیر سپاٹے نہیں کر سکتے۔ سنا۔ اگر میں نے دیکھا کہ تم پھر دس بجے رات کو گھر آئے ہو تو گدّے اتار کے گھر میں بٹھال دوں گا!"

وہ منہ چلاتا رہا۔ خاصہ غصہ دلانے والا اسٹائل تھا۔ چنانچہ چھوٹی چچی کو غصہ آگیا۔ بولیں:"

" رات ہی پر کیا موقوف ہے۔ آپ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ صبح بستر سے اٹھ کر یوں باہر بھاگتا ہے جیسے موئے نگوڑے دوستوں کو بھی موت آتی ہے۔ پھر باہر سے آیا۔ حلق تک کھانا دھانسا اور لیجئے پھر باہر۔ میں جانوں شائد ہی کوئی سینما اس جنم جلے سے بچ رہتا ہو!"

" کیوں؟" چچا میاں نے آنکھیں نکالیں۔"

" میں خود سے نہیں جاتا۔ چچا میاں۔!" ہشام نے سخت مسکینی صورت بنا کر کہا۔" مجھ سے آپ قسم لے لیجئے۔ اب دوست احباب اتنا مجبور کرتے ہیں۔ ٹکٹ تک لے آتے ہیں تو ان کا دل رکھنے کے لئے مجھے جانا ہی پڑتا ہے۔"

" سچ کہتا ہوں۔ جی چاہتا ہے۔ مارے ہنٹروں کے کھال ادھیڑ ڈالوں۔" ڈھٹائی دیکھ رہے ہیں آپ بھائی صاحب!" چھوٹے چچا کا چہرہ لال ہو گیا۔"

آج ہشام کے ستارے گردش میں تھے۔ اس کی چھوٹی بہن شینا بولی "میں بھی ایک بات بولوں ڈیڈی۔ ابھی پرسوں پہلی تاریخ کو شامی بھیا ممی کی الماری سے دو سو روپے چرا کر بھاگے تھے۔ پھر ممی نے ڈانٹ ڈانٹ کر پوچھا تو ممی کو بہت ٹیڑھے ٹیڑھے جواب دئے!"

"ہائیں!" چھوٹے چچا کا منہ کھل گیا۔ بیوی سے بولے "اور تم نے مجھ سے تذکرہ نہیں کیا!"

وہ چپ رہیں۔

"کیا کئے وہ روپے!" چچا میاں چلائے۔ ہشام اچھل پڑا۔ ڈرتا ڈرتا بولا "وہ۔ وہ تو۔ ممی کو ستانے کے لئے نکالے تھے۔ پھر واپس رکھ دئے!"

اور یہ کہہ کر قہر آلود نظروں سے اپنی چھوٹی بہن کو گھورتا ہوا بولا "اچھا اچھا یاد رکھنا۔ چغل خور کہیں کی۔ اُس دن فرج سے نکال کر چوری چوری کھوئے کی بوندیں کھا رہی تھی۔ میں نے تو کسی سے شکایت نہیں کی! اچھا دیکھو گا تجھے"

"تجھے تجھے کہہ کے بولتے ہیں چچا میاں!" شینا نے ہونٹ بسور دے۔

"رہ جا" ہشام دانت پیس کر اٹھا۔ شینا بھاگی۔ وہ مٹھیاں باندھ کر اس کے پیچھے بھاگا۔ شینا تو چوکڑی بھرتی راہداری میں گم ہو گئی۔ وہ وہیں رک گیا۔ اور پھر چپکے چپکے وہ ہنسنے لگا!"

سب نے نہایت مایوس انداز سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بالکل وہی انداز تھا جیسے کہتے ہوں کہ اب بیمار کا علاج ممکن نہیں۔ اسے خدا پر چھوڑ دینا چاہئے!"

سب سے پہلے پھوپھا ابا اٹھے "اب ہم چلتے ہیں۔ ذرا۔ وہ۔ کچھ کام تھا۔"

انہوں نے سر کھجایا۔ بیوی کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں سہران سے پوچھنا چاہتے ہوں انہیں کیا کام تھا؟۔ چنانچہ وہ بولیں: "کمر میں درد تھا۔ حکیم صاحب کے پاس جا رہے تھے!"

"ارے ہاں۔ ٹھیک ہے۔ کمر کا درد یاد ہی نہ رہا تھا!" وہ تیز تیز چل دئے!" پھر سب ہی اٹھ گئے!"

منصور میاں کی سیدھی سادی شادی کی پُر مسرت چہل پہل کچھ سرد ہوئی تو ہشام کی شرارتیں پھر سے نمایاں ہو گئیں۔ دن بھر مرد گھر سے باہر رہتے تھے۔ اور وہ تین چار گھنٹوں کی باہری سیر و تفریح کے بعد گھر ہی میں گھسا رہتا تھا۔ اُن دنوں بڑی باجی خاصے طویل وقفے کے لئے میکے آئی تھیں۔ جب بھی اُن کے میاں باہر سر دورے پر چلے جاتے وہ اپنی ساس سے اجازت لے کر میکے آ براجتیں۔ چونکہ ان کی سسرال میں ان کی جٹھانی اور دیورانیاں خاصی معقول تعداد میں تھیں اور دو بن بیاہی نندیں بھی تھیں۔ لہٰذا ان کا بار بار میکے بھاگنا کسی کو گراں بھی نہیں گزرتا تھا۔ ان کی ساس بہت اچھی تھیں۔ اپنی بہوؤں کو بہوئیں نہیں سمجھتی تھیں۔ بہوؤں کا بھی یہ حال تھا کہ کیا مجال جو بڑی بی کو ساس سمجھ کر کچھ نامناسب سلوک کریں۔ نندیں بھی بےچاریاں بے زبان۔ خاموش اور بہت شریف بچیاں تھیں۔ ویسے ان کا پورا خاندان ہی بہت مہذب تعلیم یافتہ اور وادا نجا تھا۔ بڑی باجی کے شوہر بھی بہت شریف، خوش مزاج اور زندہ دل آدمی تھے۔ انہوں نے بیوی کو میکے آنے جانے کی پوری آزادی دے رکھی تھی۔ اس کے علاوہ بڑی باجی کے ہاں اب دوسرے بچے کی آمد آمد تھی۔"

ان کا ارادہ میکے ہی میں رہنے کا تھا۔ پہلا بچہ دو سال کا خوب پیارا ابھرا سا تھا۔ گھر بھر کا کھلونا۔ وہ اس شو سے گھر میں آتا اور سارا گھر جیسے انگڑائی لے کر جاگ اٹھتا تھا۔ سامرہ، شینا، کمال، ہشام اور دوسرے بچوں کی دلبستگی کا سامان۔ اپنی ماں کے پاس تو جاتا ہی نہ تھا۔ یا تو دونوں نانیوں کے پاس رہتا۔ یا پھر بچوں میں کھیلا کرتا۔ مگر ہشام اور سامرہ کے لئے اس کی ننھی سی ذات بہت بڑے جھگڑے کا باعث تھی۔ سامرہ کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کی باجی کا بچہ ہے۔ لہٰذا اس پر صرف سامرہ ہی کا حق ہے۔ ہشام کو میرے تیرے کا کوئی خیال ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ تو بے حد برا مان جاتا۔ باجی تو اس کی بھی تھیں۔ چچازاد بہن اور سگی بہن میں فرق ہی کیا؟ مگر سامرہ اپنے بے پناہ غصے میں پردادا تک پہونچ جاتی تھی۔ بڑی باجی تو بس یہی چاہتی تھیں کہ وہ بچے کی جھنجھٹ سے دور رہیں۔ ننھے کو دالان میں ہنکا کے وہ اور نئی بھابی بڑے کمرے میں چلی جاتیں۔ پھر دونوں جہان کی بکواس ان کی زبانوں پر آجاتی۔"

بے حد دلچسپ دن تھے۔ اس زمانے میں کالجوں میں میقاتی چھٹیاں ہو گئی تھیں لہٰذا سامرہ دن بھر گھر ہی پر رہتی۔" ہشام کے لئے تو ہر دن تعطیل کا دن تھا۔ صبح سے شام تک ایک ناسمجھ بچے کی طرح ہڑدنگا مچایا جاتا۔ یا پھر پھوپھا ابا سے سرگوشیاں ہوتیں۔"

"آپ نے آج کا اخبار دیکھا؟"

وہ ناک کی پھننگ پر چشمہ اٹکائے بڑی تشویش سے اسے دیکھنے لگے۔"

"ہاں کچھ دیکھا تو تھا۔ کیوں۔ کوئی خاص خبر ہے کیا؟"

"اجی آپ بھی بڑے بھولے بھالے ہیں پھوپھا ابا۔" اس نے ان پر ترس کھایا جیسے وہ اس سے عمر میں کہیں چھوٹے ہوں۔"

میں نے کیا کیا۔ ؟" وہ بے حد بھولپن سے بولے۔ ہشام آگے کھسکا۔" آپ نے فلموں کے اشتہار بھی دیکھے ؟"

آہستہ بولو۔" پھوپھا ابّا نے شرارت آمیز سرگوشی کی۔" اور اس بچے کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگے جو کسی نئی شرارت کا پلان بنا رہا ہو پھر آگے جھک کر پھسر پھسر کی۔"

" فلم ؟" کوئی نیا آیا ہے ؟" میں نے وہ صفحہ نہیں دیکھا۔ ارے میاں۔ اُن ننگی چڑیلوں کی تصویریں دیکھتے تمہاری پھوپھی دیکھ لیں تو مار کے حشرات بچا دیں۔ کہیں گی۔ بڈھے ہو گئے ہو مگر۔"

" آپ کی بھی باتیں۔ میں تو سب سے پہلے اخبار کا وہی صفحہ دیکھتا ہوں۔ مجھے کوئی اس طرح نہیں کہتا!"

" واقعی"

" جی ہاں"

کمال ہے۔! مگر۔ تم پڑھ تو سکتے نہیں۔ کیا سمجھ میں آتا ہے ؟" یہ لیجیے۔" ہشام ہنسا۔" ارے۔ کیا میں نے تیسری جماعت تک نہیں پڑھا۔ اتنی اُردو تو آتی ہی ہے۔ اس کے علاوہ میں ساری ایکٹریسوں کے چہرے اس قدر شدت سے پہچان گیا ہوں کہ جب بھی کسی کی صورت پر نظر پڑتی ہے۔ فوراً جان جاتا ہوں کہ یہ کاہے میں کام کر رہی ہے۔ ارے آپ مجھ سے ہر ہیرو اور ہیروئن کی پوری پوری سوانح عمری منھ زبانی فر فر سُن لیجئے پھوپھا ابّا!"

ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔!" انہوں نے بڑی عقیدت سے کہا۔ ہشام نے ہونٹ بھینچ کر ہنسی روکی اور کھنکھار کر بولا۔" تو پھر آج شام کو کپڑے وپڑے پہن کے تیار بیٹھئے گا۔ ہم چلیں گے ٹارزن کی بھتیجی دیکھنے!"

"م۔ مگر۔ میاں۔ پیسے۔
مفت تو کوئی دکھائے گا نہیں!"

"پھوپھی اماں کی صندوقچی!" اس نے ایک آنکھ دبا کر ترکیب بتائی "پتہ ہی نہیں چلتا۔"
"وکی کہاں ہے؟" پھوپھا ابا بے بسی سے بولے "آپ اس قسم کی شدید ضرورتوں کے لیے کچھ پیسے اپنے پاس نہیں۔ دیکھئے یہ بڑی بری بات ہے" ہشام نے انہیں ہشکار دیا "لاحول ولا قوۃ۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے پھوپھی اماں کے سامنے ہاتھ پھیلائیے۔ توبہ!"
"تم ہی کوئی بندوبست کر دو!" انہوں نے بڑے دکھ سے کہا "آپ رہنے دیجئے۔ میں آپ کی خاطر ضرور کوئی انتظام کر دوں گا"
"اچھا تو میں وہ شیروانی پہن کے تیار ہو جاؤں جو منصور میاں کی شادی کے موقعہ پر سلوائی ہے" پھوپھا ابا کا چہرہ سورج مکھی کے پھول کی طرح کھل گیا۔

"ہاں۔ بس" اور استری کیا ہوا کڑک دار پاجامہ۔ سلیم شاہی جوتا۔ عطر لگا رومال" ہشام نے برابر کے دوستوں کی طرح قہقہہ لگا کر ان کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ چنانچہ پھوپھا ابا نے بھی ایک توبہ شکن قہقہہ لڑھکا دیا اور بڑی ممنونیت سے بولے۔

"میاں میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔ تم اگر اس طرح قدم قدم پر میرا خیال نہ کیا کرو تو میں سچ کہتا ہوں کہ میں تو بالکل یتیم ہو کر رہ جاؤں" ان کی آواز بھرا گئی۔

ہشام نے پدرانہ شفقت سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بزرگانہ لہجے میں کہا "ارے۔ اتنی اتنی سی باتوں پر یوں خون نہ جلایا کیجئے۔ جب تک میں

زندہ ہوں۔ آپ کو بے سہارا محسوس نہ ہونے دوں گا۔ دل چھوٹا مت کیجئے پھوپھا ابّا۔"

اچھا میاں۔" وہ ایک سسکی لے کر چپ ہو گئے۔"

لیجئے۔ یہ کھائیے!" ہشام نے اپنا چھوٹا سا ہینڈ بیگ کھولا اور تلے ہوئے کاجوؤں کا پیکٹ نکال کر انہیں دیا۔"

"آپ نے قلا قند کب سے نہیں چکھی؟"

قلا قند!" ایک بڑا سا گھونٹ نگل کے پھوپھا ابّا نے کہا۔ "میں تو اس کا مزہ بھی بھول گیا ہوں۔"

"چچ چچ۔ یہ پھوپھی اماں آپ پہ بہت ظلم کرتی ہیں۔ کل میں آپ کو ضرور کھلاؤں گا!"

کاجو چباتے ہوئے انہوں نے پُر مسرّت انداز میں سر ہلایا۔ پھر بولے۔ "یہ کیا۔ اتنی جلدی چلے؟"

"باہر ایک دوست کھڑا ہے جناب۔ اب تک تو وہ دھوپ میں سوکھ کر چھوہارہ بن چکا ہو گا۔ اسے ساتھ لے کر میں ذرا ٹکٹوں کا بندوبست کر آؤں۔"

"پیسے کہاں ہیں؟"

وہی اُدھار دے گا۔ بعد کو آپ اور ہم اپنے اپنے ٹکٹوں کے پیسے اسے چکا دیں گے!"

"ارے ہاں۔ میں بھی جا کے تمہاری پھوپھی کی خبر لیتا ہوں۔ یعنی کہ کیا بات ہے یہ بھی۔ مجھے ماہانہ خرچ کے لئے بھی دس پانچ نہیں دیتیں!"

"اور رر۔ یہ پیکٹ تو چھپا دیجئے۔ پھوپھی دیکھیں گی تو جھپٹ کر سارے

کھالیں گی !"

ہاں ہاں " انہوں نے کہا اور تیل اور مرچ میں تھڑا ہوا پیکٹ انہوں نے بڑی مہارت سے بڑے نفیس تکئے کے نیچے چھپا دیا اور پھوپھی سے لڑائی کرنے کے لئے دیوان خانے سے اندر جانے لگے !"

ہشام نے مشورہ دیا " پھوپھا حضور، بس دس پندرہ کی حد تک جھگڑا کیجئے گا زیادہ کے لئے نہیں۔ جلدی جا کے آیئے۔ میں باہر ٹھہرا ہوں !"

انہوں نے اپنے لدھوڑے پاجامے کے پائنچے اچک سر کائے اور کرتے کی جھولتی ہوئی آستینیں چڑھا کے محاذ پر چلے گئے !"

پھوپھی سامنے ہی صاف ستھرے چھوٹے دالان میں ہوا کے رخ پر بیٹھی ساگ صاف کر رہی تھیں۔ قدموں کی دھمک پر سر اٹھا کر دیکھا۔ پھوپھا نے بھی دیکھا۔ پھر پھوپھی تو بُرا سا منہ بنا کر اپنے کام میں لگ گئیں۔ مگر پھوپھا چند لمحے پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں گھورا کئے۔ اس کے بعد ٹوپی سے اپنا چہرہ چھپایا اور جھپاک سے باہر بھاگے !" دروازے پر ہشام کھڑا اپنے دوست سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے جلدی سے مڑ کر دیکھا اور بدحواسی کی وجہ پوچھی۔ ہانپتے ہوئے بولے۔ میاں۔ وہاں کوئی خاتون بیٹھی ہیں زنان خانے میں۔ شاید تمہاری پھوپھی سے ملنے آئی ہیں۔ میں آواز دئے بغیر اندر گھس گیا تھا۔ بڑا غضب ہوا۔ ان کا میرا سامنا ہو گیا۔ اب وہ دل میں کیا سوچیں گی کہ جناب سید صاحب اس قدر لفنگے آدمی ہیں۔ غیر عورتوں کو گھورتے پھرتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ !"

مارے پچھتاوے اور شرمندگی کے ان کا بُرا حال تھا !"

آپ گھبرایئے نہیں۔ میں ابھی دیکھ آتا ہوں !" ہشام اندر گیا۔ اسے صرف پھوپھی ملیں جو اب ننھی سی خوشنما ٹوکری اٹھائے کچن میں جا رہی تھیں۔ اسے

دیکھ کر ٹھہر گئیں اور مسکرا کر بولیں ؛

پھر کوئی شیطانی سوجھی ہے رے پاجی ۔ پہلے وہ اندر آ کے جاسوسی کر گئے ۔ اب تو آیا ہے چوہے کی طرح ۔ سچ بتا ۔ بات کیا ہے ۔ ورنہ کان کھینچ کر ہاتھ میں دے دوں گی ! ؛

آپ کے پاس ابھی کون تھا ؟ ؛ ہشام نے پوچھا ؛

کوئی نہیں ۔ اکیلی بیٹھی فرنی بنا رہی تھی ؛

ارے پھوپھی ۔ آج آپ نے ہمارے پھوپھا ابا کو خوب ڈرایا ۔ وہ باہر بیٹھے رو رہے ہیں ! ؛

کیا ؟ ؛

جی ہاں ۔ آپ کو بھول گئے ۔ کہہ رہے ہیں کہ ایک غیر خاتون سے میرا سامنا ہو گیا ؛

چل دور خبیث ۔ جیسا تو ویسے وہ ! ؛ پھوپھی اچانک غرائیں اور ٹوکرا سنبھال کر آگے بڑھ گئیں ؛

وہ باہر آیا مارے ہنسی کے گرا گرا جا رہا تھا ۔ پھوپھا کا ہونق چہرہ دیکھا تو سچ مچ چہرے پر آ رہا ! ؛

؛ پھوپھا ابا ۔ وہ ۔ وہ تو ۔ پھوپھی اماں ہی تھیں ۔ کوئی نئی خاتون نہیں ہیں ؛

؛ چلو ہٹو ! ؛ پھوپھا ابا نے اپنا دل سنبھال کر مشکوک انداز میں خالص نزاکت سے کہا ؛

سچ مچ ۔ آج آپ نے غضب کیا ! ؛

وہ ہنسے ۔ کھسیانی سی ہنسی تھی ۔ بولے ؛ اماں ۔ وہ بھی عجیب عورت ہیں ۔ کچھ اس طرح روز روز نیا سنگار کرتی ہیں کہ آدمی دیکھے تو پہچان ہی نہ سکے ! ؛

اور اس چپقلش میں پھوپھا لڑائی جھگڑا بھول گئے۔ نہ یہ یاد رہا کہ شام کو حسبِ قرار داد قلم دکھنا اور پیسے وصول کرنا ہیں۔ ہشام کے جانے کے بعد وہ اپنی پسندیدہ آرام کرسی پر آ لیٹے اور "مسجد سے میخانے تک" پڑھ کر قہقہے لگانے لگے!!

پھوپھی تک ان جاندار قہقہوں کی گونج بخوبی جا رہی تھی۔ مگر وہ خود بھی مسکراتی رہیں اور بی رحمن کے ساتھ مل کر کھانا پکاتی رہیں۔ وہ ان کی عادتوں سے واقف تھیں۔ انھیں اپنے بھولے بھالے شوہر پر بے پناہ ترس آتا۔ ان سے محبت بھی بے پناہ تھی۔ ایک ناسمجھ بچے کی طرح وہ ان کی رتی رتی ضرورتوں کا خیال رکھتی تھیں۔ ایسا پیارا اتنا عمدہ اس قدر پُر محبت شوہر دنیا کی کسی عورت کو نصیب نہ ہوا تھا۔ جو ایک پناہ گاہ تھا۔ محافظ تھا۔ سر پر ایستادہ سائبان تھا۔ اور نہ حاکم تھا نہ اپنی نام نہاد برتری جتاتا تھا۔ جو بالکلیہ بیوی کے رحم و کرم پر تھا۔ معصوم، مظلوم، جو ہمدردی کے قابل تھا۔ پھوپھی ان پر جان چھڑکتیں۔ اور پھوپھا انہی سے دلار کیا کرتے۔ اتنا احساس انہیں تھا کہ اگر بیوی ذرا بھی بے رخ ہو جائیں تو پھر وہ قطعی لاوارث اور بے دست و پا ہو کر رہ جائیں۔

قہقہے اب بند ہو چکے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے لئے پھوپھی انہیں بلانے آئیں۔ وہ بڑے مزے سے بے خبر سو رہے تھے۔ آرام کرسی کی پٹی پر سر رکھا تھا۔ پھوپھی نے سوچا کہ اچھا ہے کچھ دیر اور آرام سے سو لیں۔ چپکے سے تکیہ اٹھایا کہ سر کے نیچے رکھ دیں۔ پٹی گرم تی ہوئی۔ تکیہ اٹھایا تو انہیں بڑا غصہ آیا۔ سارا نفیس غلاف مرچ اور تیل سے ناس ہو کر رہ گیا تھا۔ اب انہوں نے پیار محبت طاق پر رکھ کر غصے ... گھٹنا ... یا۔ وہ سمجھ

کاہلی سے جاگے۔ اور پھر لمبی لمبی جمائیاں لینے لگے۔"

"یہ کیا ہے؟" پھوپھی نے ایک ہاتھ میں پکڑا تکیہ دوسرے ہاتھ میں لی ہوئی کاجو کی تھیلی ان کے چہرے کے آگے نچائی!"

وہ گھبرا کر سیدھے ہو بیٹھے پھر دونوں چیزوں کو گھور کر بولے "یہ تمہاری بڑی بری عادت ہے کہ میرے کمرے میں بیٹھ کر الم غلم چیزیں کھاتی پیتی ہو۔ بھلا یہ نجس تھیلی تم نے میرے تکیے تلے کیا سمجھ کر چھپا دی۔ غارت کر کے رکھ دیا غلاف"

"میں نے غارت کر دیا؟" انہوں نے دانت پیسے "سچ کہتی ہوں اب آپ روز بروز کچھ اور کھلکڑ ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ ہشام نے کاجو آپ کو کھلائے اور آپ نے بچے ہوئے کاجو تکیے تلے رکھ دیئے!"

"میں کہتا ہوں۔ تمہارا حافظہ اب روز بروز دغا دے رہا ہے۔ تم صبح سویرے بادام کھایا کرو۔ واللہ یہ بھی خوب رہی۔ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا میں نے چھوٹے بچے کی طرح ہشام سے کاجو لے کر کھائے اور۔ اور۔۔۔"

"اچھا اچھا میں ہی سٹھیا گئی ہوں۔ یہی سہی" وہ غصے سے بولیں۔ "یہاں تو ہر بات مجھ ہی پر الٹ پڑتی ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے میں نامراد جانے کیوں الجھ پڑتی ہوں۔ اب چلئے گا کھانے کے لئے کہ یہیں کھانا لا دوں اور ہاتھ سے نوالہ بنا کر منہ میں دوں؟"

"کھانا؟" پھوپھا ابا جو بے حد انہماک سے بیوی کا لیکچر سن رہے تھے۔ خوش ہو کر بولے "خواہ مخواہ اتنی دیر تک وقت ضائع کیا۔ پہلے ہی کہہ دیتیں کہ کھانا نکالا ہے۔ تمہارے سر کی قسم۔ میرے پیٹ میں تو چوہے بلیاں سب ہی دوڑ رہے ہیں!"

منصور نے ہشام کو ٹیوٹر کی جو دھمکی دی۔ وہ پوری کر دکھائی جب

کے بعد جب ہشام صاحب   چمکتی اور چاندنی سا سفید پتلون پہن کے پلے گراؤنڈ تشریف لے جا رہے تھے۔ رمضانی منصور کے اجلاس پر طلبی کا حکم لے کر پہنچ گیا۔

” جلدی بلایا ہے میاں “

جلدی !! “ ہشام نے ماتھا پیٹ کر کہا ” کیا قاضی صاحب دوسری جگہ نکاح پڑھانے جا رہے ہیں ؟ “

نکاح ؟ “ رمضانی نے آنکھیں نکالیں ”

” پھر جلدی کا ہے کی ؟ “

” میاں وہ ماسٹر صاحب آئے ہیں ! “

لگ گئی سکرات “ ہشام کراہا ” ابے۔ میں بھاگا جاتا ہوں۔ تو کہہ دیجیو کہ میاں کمرے میں نہیں ملے۔ کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں “

نہیں میاں “ رمضانی نے نفی میں سر ہلایا ” مجھے اپنی چندیا گنجی نہیں کروانی ہے۔ آپ نیچے سے ہنس رہے تھے۔ منصور میاں نے سب سن لیا۔ تبھی تو بھیجا ہے مجھے کہ اُس سے کہو قمیص بند کرے اور فوری آئے ! “

رمضانی نے عمر بھر سین کو شیں کہا تھا۔ ہو نہ ہو سا بیس اکیس سال کا لڑکا تھا اور ہشام سے اس کی خوب پٹتی تھی۔ دونوں رازدار دوست تھے۔ چنانچہ ہشام کو آدمیوں کا لباس پہن کے اور قمیص مضبوطی سے بند کر کے منصور کے پاس جانا پڑا۔ گیا اور جاہل مطلق گنواروں کی طرح کسی قسم کے بھی رسمی سلام دعا کے بغیر کھڑا ہو گیا ! “ حالانکہ منصور کے علاوہ سب نے اسے تاکید کی تھی کہ کوئی بھی بزرگ یا باپ بھائی اور چچا کا ملا قاتی آئے تو سے سلام ضرور کرے۔ اس وقت منصور کو بے حد غصہ آیا چپکے سے دانت پیس ... انہوں نے سرد لہجے میں کہا “

"سلام کرو!"

ہشام نے بڑے ادب سے منصور کو سلام کیا۔ ان کا پارہ اور چڑھ گیا۔ جی چاہ رہا تھا کہ پیٹ کر رکھ دیں۔ یا خوب سا جھٹکاریں۔ مگر وہ ضبط کر کے بولے:

"مجھے نہیں۔ آپ کو۔ یہ صاحب تمہارے ٹیوٹر۔ مطلب یہ کہ تمہارے استاد ہیں۔ روز اسی وقت تم کو پڑھانے آئیں گے۔ تھوڑا تو تم کو آتا ہی ہے۔ میں نے حضرت سے کہا ہے کہ تمہیں ساتویں جماعت کے امتحان کے لئے تیار کر دیں۔ پھر پرائیویٹ طور پہ میٹرک کر لینا۔ اس کے بعد تعلیم آسان ہے جھٹ پٹ انٹر اور بی۔ اے ہو جانا۔ اور ---"

"جی ہاں" استاد صاحب موٹی آواز میں بولے "بشرطیکہ صاحبزادے نے جی لگا کر پڑھ لکھ لیا۔ آپ دیکھئے مسٹر منصور کہ میں نے گارنٹی دے کر طالب علموں کو پاس کروایا ہے!"

"جی ہاں" منصور نے جواب دیا "اصلی چیز تو طالب علموں کی دلچسپی، محنت اور لگن ہے۔ اچھا تو ہشام۔ اپنی کتابیں لاؤ۔ آج ہی سے پڑھائی شروع ہو جائے۔ یوں بھی بہت وقت ضائع ہو چکا ہے"

"ک۔ک۔ کون سی کتابیں؟" نہایت پریشان ہو کر ہشام نے پوچھا۔ "جو تم نے پڑھی ہیں۔ نامعقول!" منصور کو غصہ آگیا۔

"اچھا۔ وہ تیسری جماعت کی۔ ابھی لایا" وہ مستعدی سے بولا اور بھاگ کر اندر چلا گیا۔ منصور نے بے حد ندامت سے کہا "اب کیا عرض کروں جناب۔ ماں باپ اور دوسرے متعلقین کے بے جا لاڈ پیار نے اسے قطعی کورا کر کے رکھ دیا ہے۔ حد ہے کہ تیسری کلاس کے بعد اس نے آج تک کچھ پڑھا

ہی نہیں۔ اس کے ساتھ کے لڑکے آج ایم۔ اے کر چکے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے جناب کہ اس بیل کو کسی طرح آدمی بنا دیجئے۔ میں تو یہ سوچ کر کڑھتا ہوں کہ آخر اس کے مستقبل کا ہو گا کیا؟"

"مطمئن رہئے۔ میں اپنی سی کوشش ضرور کر دوں گا۔" ٹیوٹر صاحب نے جواب دیا۔ انہیں تنخواہ کے ڈھائی سو روپے ماہانہ بھلا کہاں برے لگ رہے تھے۔ جبکہ حسب روایت ان کی جیب پہلے ہی گرم ہو چکی تھی۔

"کوڑھ مغز اور حد درجہ غبی ہے۔ آپ کو کچھ صبر و ضبط سے کام لینا پڑے گا۔" منصور نے کہا۔ "کیونکہ ایک معمولی سی بھی بات اس کے بھیجے میں کچھ مشکل سے اترتی ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ آپ بہر صورت اسے کسی قابل تو بنا ہی دیں گے۔ براہ کرم اتنا خیال رہے کہ حد سے زیادہ ڈانٹ ڈپٹ نہ کیجئے گا۔ چھوٹا سا بچہ تو ہے نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بددل ہو کر پڑھنے سے انکار ہی کر دے!"

"بہت اچھا۔ میں خیال رکھوں گا!" ٹیوٹر صاحب بولے۔

ہشام صاحب تشریف لائے! بڑے اہتمام سے فخریہ انداز میں تین چار پھٹی نچی ردی بوسیدہ سی کتابیں کاپیاں اس طرح ماسٹر صاحب کے سامنے رکھ دیں گویا کہتے ہوں کہ سپردم بتو مایۂ خویش را۔ اس کے بعد تم جانو تمہارا کام جانے۔ حساب کم و بیش دوسرا دیکھے۔"

منصور نے سخت شرمندگی سے ہونٹ چبائے۔ ماسٹر صاحب حیران دکھائی دئے۔ مسکراہٹ فقط ہشام کے لبوں پر تھی۔

منصور کو ڈر لگا کہ کہیں وہ لسے مار نہ بیٹھیں۔ لہذا انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولے۔"

"آپ ان کا امتحان لیجئے۔ میں چلتا ہوں۔ کچھ چائے وغیرہ" وہ اٹھ کر چلے گئے۔

"بیٹھئے!" ماسٹر صاحب نے ہشام سے کہا۔ وہ بھس بھرے بورے کی طرح صوفہ پر یوں بیٹھا کہ اسپرنگ بول اٹھے۔

"جب کوئی بیٹھنے کی دعوت دے تو شکریہ کہتے ہیں" ماسٹر صاحب نے کہا۔ "مجھے تو آج تک کسی نے بیٹھنے کی دعوت نہیں دی" ہشام نے حیرت سے کہا۔

"میرا جب جی چاہتا ہے۔ خود ہی اٹھ جاتا ہوں خود ہی بیٹھ جاتا ہوں۔ اور میں تو یہ سمجھتا تھا کہ دعوت فقط بریانی اور شاہی ٹکڑوں کی۔۔۔"

"صاحبزادے۔ صاحبزادے۔ آپ کہاں کی ہانک رہے ہیں" ماسٹر صاحب نے ٹوکا۔ "میری آپ سے گزارش ہے کہ براہ کرم پڑھنے لکھنے میں دل لگائیے" میں منصور صاحب کے سامنے سبک اور خفیف ہونا نہیں چاہتا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ آپ کو مڈل اور میٹرک کے لئے ضرور تیار کر دوں گا۔! مجھے یہ بتائیے کہ آپ نے پڑھائی چھوڑ کیوں دی۔ کیا آپ کو یہ امنگ نہیں کہ آپ بھی ڈگری ہولڈر کہلائیں؟" اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں آپ کا نام بھی لیا جائے؟ اتنی ساری عمر آپ نے ضائع کر دی اس کا آپ کو افسوس نہیں ہے؟"

"ہے ماسٹر صاحب۔ بہت ہے" ہشام نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ "مگر جب بھی میں نے افسوس کیا۔ مجھے ممی نے گلے لگایا اور بولیں کہ دور پار دشمن میرا اکلوتا بیٹا نگوڑی چار حرف پڑھائی کے لئے آنسو بہائے۔ خون جلائے۔ نوج وہ کون سا نوکری کرنے جا رہا ہے۔ اللہ رکھے۔ باوا کی

اتنی جاگیر ہے کہ مرتے دم تک آرام سے بیٹھ کر کھا سکتا ہے۔ اور بس۔ ماسٹر صاحب۔ انہوں نے کتابیں اٹھا کر طاق پر دھر دیں اور آنسو پونچھ کر بولیں۔ جا بیٹے دماغ خالی نہ کر۔ جا کے کھیل کود آ۔ آپ ہی بتائیے میں ممی کا کہا کیونکر ٹال دیتا!"

بے حد شدت سے اپنا غصہ ضبط کر کے ماسٹر صاحب بولے: "اچھا تو کیا آپ کے والد صاحب بھی کچھ نہیں بولتے تھے ...؟"

ہشام ہنسا: "ارے۔ والد صاحب کی آپ نے بھلی چلائی۔ مجال ہے ممی کے سامنے ڈیڈی کے فرشتے بھی مار جائیں۔ انہیں منہ تک کھولنے نہیں دیتیں۔ ڈیڈی ہکلا کے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ممی زوردار ڈانٹ سے انہیں چپ کر دیتی ہیں۔ بے چارے میرے ڈیڈی۔ کبھی کبھار تو چھپ چھپ کر روتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ بیٹا کہنا مت اپنی ممی سے کہ میں رو رہا تھا۔ وہ اور خفا ہوں گی۔ عجب نہیں کہ مار ہی بیٹھیں!"

لاحول ولاقوۃ!"

جی ہاں اور کیا!" ہشام نے پھر سلسلہ جوڑا: "ایک دفعہ لکڑی لیکر ان کے پیچھے دوڑیں تھیں۔ وہ تو بھاگ کر کمرے میں چھپ گئے مگر میں بیچ میں آ گیا۔ اف وہ لکڑی میری پیٹھ پر دو ہو گئی۔ یقین کیجئے۔ ماسٹر صاحب رات کو میری آنکھوں کے سامنے سورج چمک گیا۔"

باتوں میں وقت مت ضائع کرو۔" ماسٹر صاحب بددل ہوتے جا رہے تھے۔"

مجھے بتائیے۔ آپ نے اب تک کیا کیا پڑھ لیا ہے۔ میں آپ کی علمی استعداد کا اندازہ لگانا چاہتا ہوں تاکہ اسی کی مناسبت سے آگے پڑھاؤں!"

"تیسری کلاس کی کتابوں کے سامنے تو بڑے سے بڑا میٹرک پاس میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔" ہشام فخریہ انداز میں ہنس کر اور شان سے سینہ پھلا کر بولا: "آپ پڑھوا لیجئے۔ کوئی سا سبق۔ مثلاً یہ ہرن اور خرگوش کی کہانی، شیر اور لومڑی کی کہانی۔ اور ---"

ماسٹر صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ زور دار طمانچہ اس کے گال پر جھڑ دیں۔ یہ عمر اور یہ باتیں۔ وہ تو پوسٹ گریجویٹ طالب علموں کو بھی کوچ کرتے تھے۔ انہیں منصور پر بھی غصہ آ گیا۔ اس کو دن کے لئے کسی راہ چلتے کا انتخاب بھی درست تھا۔ انہوں نے اس کی ردی کتابیں اسی کے آگے سرکا دیں اور ٹھنڈی سانس لے کر بولے:

"صاحبزادے۔ بات در اصل یہ ہے کہ میرے دماغ میں اتنا گودا نہیں جو میں آپ کے ساتھ سر پھوڑ سکوں۔ میں بڑے افسوس سے معافی چاہتا ہوں۔ آپ یہ فیس کی رقم مسٹر منصور کو واپس کر دیجئے اور ان سے کہہ دیجئے کہ میں کل سے نہیں آؤں گا۔"

انہوں نے بڑے انکسار سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ڈھائی سو روپے نکال کے اسے تھما دئے۔ دفعتہً یوں محسوس ہوا کہ ہشام کے چہرے پہ چاندنی سی کھل گئی ہو۔ بے حد شوق سے دانت نکال کر اس نے یوں نوٹ تھامے۔ جیسے کہ اپنے کسی بزرگ سے عیدی وصول کر رہا ہو۔ اس کے چھچھورے تبسم سے ماسٹر صاحب کے اندر آگ لگی۔ مگر وہ کچھ بولے نہیں۔ بس جان بچی لاکھوں پائے کے انداز میں کمرے سے نکل کر چلے گئے۔

ہشام نے بڑے اطمینان سے نوٹ اپنی جیب میں رکھے اور زعفرانی کو آواز دی۔ وہ سودے کی تھیلی پکڑے باہر آ ہی رہا تھا۔ اس کی آواز پہ تیزی سے قدم بڑھائے۔

"ابے رشن" کاہلی سے ہشام نے پوچھا، پلازا میں کیا چل رہا ہے؟"
رمضانی کو شہر بھر میں چلنے والے فلم ازبر رہتے تھے۔ خوش ہو کر پوچھا:
"پلازا میں۔ میاں!"
"ابے ہاں!"
"شن آف انڈیا" بے حد خوش ہو کر رمضانی نے اطلاع دی:
"تو نے دیکھی؟"
نہیں دیکھی" رمضانی نے منھ لٹکا کر کہا" بیگم شباب نے گھونسہ مار کر جیب سے پورے پیسے نکال لئے۔ بولی تھیں کہ اگر پھر کبھی سنیما کا نام لیا تو بوٹیاں کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دوں گی!"
کہہ کے نہ جایا کر دیار" ہشام نے مشورہ دیا" بے کہے سنے چل دیا کرو۔ اچھا آج پانچ بجے بن ٹھن کے تیار رہنا۔ ہم سن آف انڈیا دیکھنے چلیں گے"
آج نہیں ہو سکتا۔ میاں" رمضانی بولا" آج بیگم شباب کے پاس نکی کوئی تھی بہن کی شاہزادی آ رہی ہیں۔ وہ کیا نام۔ جن کے خوب لمبے بال ہیں۔ ایک دن شبرات میں جن کے پیچھے آپ نے پٹاخہ چھوڑ کے ڈرایا تھا!"
ہائیں!" تجھے کیسے معلوم کہ وہ آ رہی ہیں" ہشام نے دبے گھبرائے:
"انہی کے لئے تہیں پلاؤ اور کوفتے کا سودا لانے جا رہا ہوں"
رمضانی کو رخصت کر کے وہ اندر آیا۔ سب سے پہلے سارہ سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اسے علم تھا کہ ہشام صاحب ننھے بچے کی طرح پڑھنے بیٹھے ہیں چونکہ اس کی اور ہشام کی ازل سے چشم چوٹ رہتی تھی۔ لہٰذا اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی سارہ نے برا سا منھ بنا لیا:
"جب بھی تم سامنے آجاتی ہو۔ میرا ہر کام چوپٹ ہو جاتا ہے" وہ بھی برا

سا منہ بنا کر بولا: "کالی بلی کے متعلق ایسی روایت میں نے سُنی تھی!"

"کیوں۔ کون سا ایسا ضروری کام ہوتا ہے۔ جسے آپ بڑے لاٹ گورنر بنکے انجام دیتے ہیں" سامرہ نے جل کر کہا: "میں تو جانوں کہ دنیا میں سب سے ناکارہ آدمی ایک آپ ہیں۔ لکھنے کے نہ پڑھنے کے۔ ایکدم داہیات!"

"اچھا اچھا یہ ٹر ٹر بند کرو" ہشام نے اسے ڈانٹا۔

"قیامت قریب ہے لڑکیوں کی اتنی لمبی زبان۔ اماں باوا نے سکھایا ہی نہیں کہ مردوں سے ادب تمیز سے بات کرنی چاہئیے۔ مجھے تو کوڑا ارمان ہی رہ گیا کہ کبھی تو تم سر ڈھانک کے اور آنکھیں جھکا کے میرے سامنے آؤ۔ تمہیں۔ یہ بھی کوئی بڑی خوبی کی بات ہے کہ سر جھاڑ منہ پہاڑ مردوں کے سامنے چلی آتی ہو... سسرال میں نبھنے کی یہ باتیں نہیں ہیں"

مارے غصے کے سامرہ ہانپ گئی۔

"آپ ہوتے کون ہیں اتنی بکواس کرنے والے۔ بڑے آئے۔ اماں باوا اور جنم جلی سسرال کو گننے والے۔ آپ خود سسرال میں ڈنڈے کھائیں گے۔ سارے میں تھُڑی تھُڑی ہو گی۔ اتنے بڑے گینڈے ہو گئے ہیں۔ الف کا نام بیل تک نہیں آتا۔ عمر بھر یونہی جوتیاں چٹخاتے پھریئے گا۔ کوئی فقیرن بھی اپنی بیٹی نہیں دیگی پھر شرم کے مارے ڈوب مرنے کو کہیں چلّو بھر پانی بھی نہ ملے گا" غصے میں جو کچھ اس کے منہ میں آیا۔ بکے گئی۔

ہشام ہنسنے لگا: "آہا۔ اس دھوکے میں بھی نہ رہنا۔ تمہارے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ ایک بہت حسین و خوبصورت لڑکی سے میں نے دوستی کر رکھی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ہشام صاحب آپ جیسے بھی ہیں۔ بہت خوب ہیں۔ آج کہئیے تو میں آج ہی نکاح آپ سے کر لوں۔ مگر میں مجبور ہوں۔ کیونکہ جب تک گھر میں مرنے والی

بہنوں کی شادیاں نہ ہوں۔ بھلا میں کیسے اس بے چاری سے نکاح کر سکتا ہوں۔"

"آئینے میں صورت دیکھی ہے کبھی!"

"ارے میں تو اپنی صورت پر آپ عاشق ہوتے ہوتے بچا ہوں۔"

"یہ آپ نے کون سی بہنوں کو کہا ہے کہ گھر میں مری ہیں۔" نیلے پیلے دیدے نکال کر سائرہ نے پوچھا۔

"چچا میاں کی ایک پھوہڑ بد زبان اور ٹھگنی چھوکری، دو عدد بدشکل بھینسیں ابصار صاحب کی!" اطمینان سے ہشام نے کہا۔

"آپ سے سر پھوڑنا اپنی جہالت ہے!" سائرہ بولی اور ایک حقیر نظر اس پر ڈال کر چلی گئی۔

"گئے تمہارے ٹیڈر صاحب؟" ادھر سے بھابی گزریں۔

"جیتی رہیے بھابی۔ آپ نے مجھے بڑی شرمندگی سے بچا لیا۔ میں انھیں ٹائٹر صاحب کہہ رہا تھا!" "مگر آپ کو کیسے پتہ چلا صحیح "الفاظ" ٹیوٹر ہے؟"

"بے حد افسوس ہوتا ہے تمہاری حالت پر۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"بس میرے پاس ایک ڈگری ہی تو نہیں ہے اور میری عام معلومات تو بے حد وسیع ہیں۔ درجنوں اشعار، عمدہ مقولے اور نصیحت آموز حکایتیں مجھ سے سن لیجئے!" "فی الحال ایک اشعار سناؤں!"

"شعر کہو۔ شعر۔ اشعار شعر کی جمع ہے۔"

"اونہہ سب چلتا ہے۔ اتنی باریکیوں پر نظر کیجئے گا تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ آپ شعر سنئے!"

"سناؤ!" بھابی کو عمدہ اشعار سننے اور جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔

اس نے بے حد لہک کر پڑھا۔ ؎

وصل کی رات اور اتنی مختصر

سانپ کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے۔

پھر شعر کی تشریح کرنے لگا۔ "کیا بات کہدی ہے بھابی ظالم نے۔ جیسے سانپ لپ لپ کرتا ادھر سے آیا ادھر گیا۔ لوگ ہاتھوں میں ڈنڈے لئے منتظر کھڑے ہی رہ گئے کہ اب نظر آئے سالا تو اس کا قیمہ بنادیں۔ اسی طرح سے شاعر کا محبوب الو کا پٹھا ——"

بھابی کے بھیجے میں بھی اتنا دم کہاں تھا کہ وہ اس کی بکواس سنتیں۔ انہوں نے ایک آہ سرد کھینچی۔ ترحم آمیز نگاہوں سے اُسے دیکھا اور کچھ کہے بغیر مڑکر چلی گیئں!"

ہشام نے جیب میں پڑے نوٹوں کو ٹٹولا اور چپکے سے بولا: "بیٹے ڈھائی سو تم اس جیب میں پھلتے پھولتے نظر نہیں آتے!" اور خود بھی ایک مضحکہ خیز آہ بھر کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا!"

سائرہ آج صبح ہی سے بے حد خوش تھی۔ اسے ممی نے بتایا تھا کہ چند دنوں کے لئے مسحور ان کے ہاں رہنے کے لئے آرہی ہے۔ اس کی حقیقی خالہ زاد بہن تھی۔ ان دنوں اس کی دادی کا نوزمیں انتقال ہوگیا تھا۔ چونکہ ان کی وفات کے وقت مسحور کی امی اور ابا جانہ سکے تھے۔ لہٰذا اب ان کا جانا ناگزیر تھا۔ مسحور کا ٹرمنل امتحان قریب تھا۔ اس لئے اس کے والدین نے اسے اس کی خالہ کے پاس چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا!۔ اس شام تک اس کی آمد متوقع تھی۔

سائرہ کا کمرہ گھر میں سب سے الگ تھلگ تھا۔ اس نے اپنا کمرہ بڑی خوبصورتی

اور دلچسپی سے سجایا تھا۔ اور اب مسحور کو اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتی تھی۔ دونوں تقریباً ایک ہی عمر کی تھیں۔ سال چھ مہینے کی کوئی سی بڑائی چھٹائی ان میں تھی لیکن دونوں کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ سائرہ تیز طرار اور بلا کی لڑکی تھی۔ جب جی چاہتا بڑوں کا ادب کرتی۔ اور موڈ نہ ہوتا تو انہیں کبھی خاطر میں نہ لاتی۔ اپنے مزاج کی وجہ سے اس نے ابھی تک کسی لڑکی کو اپنی سہیلی تک نہ بنایا تھا۔ ویسے لڑکیاں خود اس سے کتراتی تھیں۔ جھاڑ کا کانٹا بن کر لپٹ پڑتی۔ گھر میں بھی وہ سب سے کھنچی کھنچی رہتی۔ اس کے مشاغل بھی بے حد خشک تھے۔ نہ اسے سیر سپاٹوں کا شوق تھا نہ فلم بینی کا۔ اور نہ وہ کسی سے دیر تک باتیں کرنے کی عادی تھی!! اس کی خالص اور اکلوتی تفریح کتب بینی تھی۔ فرصت کے اوقات میں بس پڑھا کرتی دن رات کے مطالعہ سے اس کی عام معلومات بہت وسیع ہو گئی تھیں۔ دوسرا مشغلہ باغبانی تھا۔ مالی کے ساتھ مل کر اپنے پائیں باغ کی دیکھ بھال کیا کرتی۔ بڑے اچھے اچھے رنگ برنگی کروٹن اور طرح طرح کے گلاب وہ نرسری سے لاتی تھی۔ جو اس کے خوبصورت چمن کی بہار میں اضافے کا باعث بن رہے تھے!!

مسحور اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس کے آگے پیچھے تین چار بچے ضائع ہو چکے تھے۔ چنانچہ وہ قدرتی طور پر ماں باپ کی تمام تر محبتوں کا مرکز تھی۔ اسے عیش و آرام نصیب تھا۔ محبت ملی تھی۔ لیکن نجانے اس کی افتادِ طبع کو کیا ہوا تھا۔ اس نے کسی کی محبت کی پرواہ نہیں کی۔ اسے اپنے آرام و آسائش کا بھی احساس نہ تھا۔ عجیب سی کھوئی کھوئی لڑکی تھی۔ جیسے اٹھارہ انیس سال کی عمر میں اسّی نوے کی سنجیدگی سمیٹ لائی ہو۔ بے حد حساس، جذباتی اور زود رنج تھی۔ کوئی اُسے ذرا سی بات کہہ دیتا تو وہ اسے دکھ یا سکھ

کا بہانہ بنائے پہروں سوچا کرتی۔ گم صم رہتی۔ ماں باپ اسے سمجھا بجھا کے ہار گئے۔ اس قدر جذباتی ہونا اچھی بات نہیں ہے۔ زمانہ ہمیشہ انسانوں کے درمیان بدلتا رہتا ہے۔ کون جانے کل کیسا ہو۔ آدمی کو ہر اچھی بری گھڑی کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ و تیار رہنا چاہئے۔ حساس انسان سکھ سے جی نہیں سکتا۔ پل پل کی موت مرتا ہے۔ اسے نہ کسی کی رفاقت اچھی لگتی ہے نہ وہ خود کسی کی تنہائی کا ساتھی بن سکتا ہے!" اور اسی قسم کی سیکڑوں نصیحتیں اسنے سنی تھیں اور ان کا قطعی کوئی اثر نہ لیا تھا۔ وہ اپنی قنوطی فطرت کو رجائیت سے بدل نہ سکی!!

قدرت نے اسے دل کھول کر دلکشی اور جاذبیت دی تھی۔ بے پناہ حسینوں میں اسکا شمار نہیں ہو سکتا تھا مگر وہ اتنی پرکشش اور جاذب ضرور تھی کہ کم از کم سینکڑوں لڑکیوں کے جھرمٹ میں نمایاں دکھائی دیتی! لیکن اس کی قنوطیت نے اس کی دلکشی پر عجیب سا کہر سا ڈھکے رکھ دیا تھا! "سنجیدگی اور بزرگی" نے اس کی ساری کشش کی ایسی تیسی کر کے رکھ دی تھی!"

سامرہ کے ڈیڈی افتخار احمد صاحب کے یہاں وہ اکثر آتی اور مہمان رہتی تھی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ لیکن ابکی اس کا قیام کچھ طویل ہونے والا تھا۔ اس کے والدین کچھ خاندانی جائداد کے بٹوارے اور کسی مقدمہ کے فیصلہ تک پونہ ہی میں رکنے والے تھے!"

ہشام بھی اسی گھر میں رہتا تھا۔ افتخار احمد صاحب کے والد نے وصیت کر رکھی تھی کہ ان کے بعد ان کے بچے افتخار احمد، ابصار احمد اور سلیمہ بیگم کبھی علاحدہ گھر بسانے کا خیال نہ کریں ہمیشہ ساتھ رہیں۔ ورنہ ان کی روح کو آسمان پر بھی قرار نہ آئے گا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کافی بڑا مکان بنوا لیا تھا اور خود اپنی مرضی سے افتخار صاحب، ابصار صاحب کو ان کے حصے دیدئے تھے

گھر ایک تھا۔ سب کا آنگن ایک تھا۔ ہانڈی چولھے بھی بٹوارے کی لعنت و نحوست سے محفوظ تھے۔ صرف کمرے الگ الگ تھے!"

سلیمہ بیگم۔ بھی اسی مکان میں آباد تھیں۔ جس طرح ان کا گھر ایک تھا۔ اسی طرح اُن مختلف قالبوں میں دل بھی ایک تھا۔ اتفاق، اتحاد، اور محبت کی خوشیاں ان سب پر سایہ فگن تھیں! بڑوں کی طرح بچے بھی بڑے پُر نیّت، مخلص اور زندہ دل تھے۔ افتخار صاحب کے بچے منصور، ماہرہ، اشہد، ساحرہ، ابصار صاحب کے بچے، ہشام، شمینا اور صدف، آپس میں ایک تھے؛

منصور اور ماہرہ کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ ماہرہ کا ایک ننھا منا بچہ تھا۔ ان کے شوہر ائیر لائنز میں چیف انجینئر تھے۔ حال میں منصور کی شادی ماہرہ کی گہری سہیلی نجمہ سے ہو گئی تھی! عجیب اتفاق تھا کہ اگر منصور کی شادی بہن کی سہیلی سے ہوئی تھی تو ماہرہ کی شادی منصور کے اپنے جگری دوست ایثار احمد سے ہوئی تھی! اس طرح خاندانوں میں کافی وسعت اور استحکام پیدا ہو گیا تھا۔ ایثار بھی بڑے خوش مزاج اور زندہ دل تھے؛

شام تک مسحور اپنی ایک خادمہ کے ساتھ آ گئی۔ گھر بھر اس کے استقبال کے لئے دالان میں اکٹھا تھا!

ساحرہ کی ممی نے اسے گلے سے لگا لیا! پیشانی چومی اور بولیں: "اے بیٹی اس موسم میں نکلی ہو۔ آسمان پر بادل برسنے کو تلے کھڑے ہیں۔ ہوائیں دم گھونٹے دیتی ہیں.... تمہارے ابا امی آ گئے؟"

جی ہاں" اس کی آواز بھی بڑی مسحور کن تھی۔ سیدھے سادے صندلی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ آدھے سر کو ڈھانکے ہوئے آنچل نے اس کی معصومیت اور سادگی میں پُر کشش اضافہ کر دیا تھا۔

اپنی خالہ سے مل کے وہ کرسی پر ٹک گئی۔"

سامرہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ پھر ایک لاپرواہ مغرور نظر ہشام پر ڈال کر یوں چہرہ پھیر لیا جیسے اس جاہل آعظم کی موجودگی اسے وہاں کھل گئی ہو۔ سب لوگ اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ بھابی نے سامرہ سے کہا: "یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے کوئی نیا آدمی گھر میں آیا ہو۔ سامرہ اسے لے جاؤ اس کا کمرہ دکھا دو۔ اور نصیبن خالہ سے کہنا کافی یہاں دے جائیں!"

"اچھا بھابی" سامرہ نے اٹھتے اٹھتے مسحور کا ہاتھ تھام لیا "آؤ چلیں۔ اب تو بہت روز کے لئے یہاں رہو گی نا۔ میرے کالج میں بھی بیس روز کی چھٹیاں ہیں۔ ہم خوب گھومیں پھریں گے۔ اچھا؟"

مسحور صرف مسکرائی اور سامرہ کے ساتھ چلی گئی۔"

ہشام کی امی نے کہا: "اے بڑی آپا سچ کہتی ہوں کہ جب سے منصور کی شادی ہوئی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے۔ خاندان بھر میں شادیاں ہی ہوا کریں۔ اپنے گھر میں بھی اللہ رکھے شادی کے قابل بچے ہیں۔ انہیں گھر بار کا کر دینا اچھا۔ میرا تو جی نہیں چاہتا کہ اب سامرہ اور مسحور آگے پڑھیں۔ آخر ماہرہ اور نجمہ نے بی۔ اے تک پڑھا مگر انہوں نے نوکریاں تو کی نہیں نا۔!"

"ارے بھائی۔ تم پلاؤ قورمہ کھانے کے چکر میں بے چاری بچیوں کی شادیوں کی آڑ لیتی ہو۔ میں یوں بھی تمہیں کھلا دوں گا" ابا صاحب نے کہا۔"

"ان بے زبانوں کو ماہرہ اور نجمہ کی طرح کم از کم بی۔ اے تو ہونے ہی دو۔" آپ نے اپنے دلارے لونڈے کا تو ناس مار ہی دیا۔ لڑکیوں ہی کو ۔۔۔!"

پھوپھا ابا نے ادھر ادھر چکر ملکر دیکھا اور پھر جھک کر بیوی سے کہا: "یہ کون لڑکی تھی میں نے ابھی تک اسے نہیں پہچانا ہے؟"

"ارے سبحان میاں وہ میری بھانجی ہے۔ مسحور شوکت، میری بہن کی بچی" سامرہ کی ممی ہنس کر بولیں "شوکت بھائی تو یاد ہیں نا تمھیں"

"ہاں ہاں!" وہ چونکے "کیا وہ خدانخواستہ ——"

"اللہ رکھے زندہ ہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نہ نکالئے گا" بیگم نے چڑ کر جلدی سے کہا "آپ کی عجیب عادت ہے۔ جس کسی کا تذکرہ سنتے ہیں۔ خدانخواستہ کہہ کر اسے مرحوم کر دیتے ہیں!"

"نفسیاتی پیچیدگی ہے بی بی!" افتخار صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ان پر جو حادثہ عین عالم شباب میں گزرا۔ وہ اسے نہ بھول سکے نہ یاد رکھ سکے۔ بس ایک گرہ سی پڑ کے رہ گئی ہے ذہن میں!"

بڑے لوگ اپنی باتوں میں مشغول تھے۔ ان سب کو یکبارگی مشتعل اور برہم کر کے محفل کا رنگ بدلنے کے لئے ہشام نے ننھے ابرار سے کہا "ابی۔ آؤ چلو۔ ہم گولیاں کھیلیں!" اور اپنے پتلون کی جیبیں بجائیں جو شیشے کی گولیوں سے لبریز تھیں اور کھن کھن بج اٹھی تھیں۔ ننھا اپنی آپا کے پاس بیٹھا دودھ پی رہا تھا۔ آدھا گلاس چھوڑ کر لپکا۔ باجی ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں۔ ہشام اور ننھا بھاگتے ہوئے برآمدہ میں چلے گئے۔

ہشام نے جیب سے ڈھیروں گولیاں نکالیں اور فرش پر بکھرا دیں۔ پھر دونوں ہم عمروں کی طرح گولیاں کھیلنے لگے۔ اگر ننھا چیخ رہا تھا تو ہشام بھی چیخ رہا تھا۔

"ابرار۔ یار وہ "بے ایمانی" کی سہی نہیں ہے" ہشام کنکھیوں سے دالان میں موجود لوگوں کو دیکھ کر کافی بلند آواز میں بولا "تم نے صاف دو گولیاں نیکر میں چھپالی ہیں۔ نکالو انھیں۔ نہیں تو جاؤ ہم نہیں کھیلتے"

سوا دو سال کے ابرار صاحب نے فرمایا "جاؤ یا نہ جاؤ" انہوں نے اپنی توتلی بولی میں یارو کو یالو کہا تھا۔ پھر بولے تھے "چاچی چاچا آپ "بے مانی کل لہے ہیں۔ نتا لیئے دُد دو لیاں۔ نئیں تو ہم بھی نہیں کھیلتے۔ ہاں!"

مٹھی بھر گولیاں فرش پر کھن کھن کر کے بکھیریں۔ ہشام نے قہقہہ لگایا "کٹ۔ وہ مارا۔ ہا ہا ہا!"

"تت۔ وہ مالا" ابرار نے نقل کی۔

افتخار صاحب نے گردن اونچی کر کے ادھر دیکھا۔ اور پھر بولے "سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں بڑا کون ہے چھوٹا کون؟"

دفعتہً سارہ نے دروازہ کھولا اور شعلۂ جوالا بنی برآمدے میں آ گئی۔ اس کے پیچھے سحر بھی تھی!"

"شور مچانے کے لئے آپ کو یہی جگہ ملی تھی؟" سارہ ہشام پر جھپٹ پڑی۔ "آپ کو ایسی ہی فضول حرکتیں کرنی ہیں تو آپ لان یا باغ میں یا سڑک پر کیوں نہیں جاتے" باجی بھی ننھے کو منع نہیں کرتیں۔ خواہ مخواہ الٹی صحبت میں خراب ہوا جا رہا ہے!"

سحر نے دیکھا۔ اب وہ پہلے سے کافی بڑا لگ رہا تھا۔ اونچا پورا صحت مند چہرے پر شرارت کی چمک تھی! آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ سفید پتلون اور کالی جرکن میں بڑا پرکشش ہو رہا تھا!"

دفعتہً سحر کی نظریں ہشام کی نظروں سے مل گئیں۔ وہ گڑبڑا گئی۔ مگر ہشام جھنجھلا کے بولا "کل آپ فرمائیں گی کہ تمہارے گھر میں رہنے سے میں ڈسٹرب ہوتی ہوں لہٰذا تم گھر چھوڑ کے چلے جاؤ تو کیا میں چلا جاؤں گا۔ آپ کو الٹی سیدھی بکواس کرنی ہو تو آپ جائیے باغ میں سڑک پہ۔ سوائے غلطی کہا نہیں

کے اور دوسری معقول بات ہی کیا ہوتی ہے؟ عقل سے پیدل لڑکیوں کے پاس!
چامی چاچا آئیے!" ابی نے اس کا دامن پکڑ کر کھینچا۔

"ہم فلمی کہانیاں کہاں کہہ رہے تھے" سحر نے اپنے سر سے الزام ٹالا۔ اور بڑی شرافت سے بولی "میں تو سامرہ کو اپنے اشعار کا کلکشن دکھا رہی تھی۔ مجھے فلموں سے بڑی نفرت ہے۔ کیا آپ کو فلم پسند آتے ہیں؟"

ہشام نے ابرار کو گودی میں اٹھا لیا اور بولا "پہلے کچھ دیر ٹھہر کے کھیلیں گے۔ اچھا۔ پہلے ان کا کلکشن دیکھ لیں!" "چلئے صاحب مجھے بھی بتائیے کیا ہے آپ کے اشعاروں کا کلکشن۔ اشعار میری کمزوری بھی ہیں!" وہ اندر آ کے اطمینان سے صوفہ پر بیٹھ گیا۔ ابرار کو نیچے قالین پر بٹھایا اور میز پر سے تازہ رسائل اٹھا کر اس کے پیروں پر ڈال دئے۔ بولا!"

"تم تب تک ان کی تصویریں دیکھو۔ ہم ذرا علمی ادبی باتیں کر رہے ہیں۔ اچھا۔ میں ان لوگوں کو قائل کر دوں تو پھر تم سے کھیلوں گا"

"اچھا" ابرار نے کہا۔ وہ رسالوں اور اخبار کا دشمن تھا۔ تصویریں دیکھتے دیکھتے انہیں چیر پھاڑ کے برابر کر دیتا۔

سامرہ نے جھپٹ کر پرچے اٹھا لئے اور چیخ کر ہشام سے بولی "آپ نکل جائیے یہاں سے۔ کسی کو آپ سے بات وات نہیں کرنی ہے۔ کوئی برابر کا پڑھا لکھا ہو تو اس سے علمی گفتگو کرتے اچھا بھی لگتا ہے۔ آپ کو کیا خاک پتہ آتا ہے ہم آپ سے باتیں کریں گے بھی کیوں؟ خوامخواہ!"

"علم وغیرہ کا تعلق ڈگریوں اور سندوں سے نہیں ہے" ہشام نے جواب دیا۔ "مجھے بتاؤ بھلا، افلاطون، سقراط، ارسطو، کون سی یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔ پھر کیا تم ان عقلمندوں کو جاہل اور کم علم سمجھتی ہو۔ واہ بھئی۔

علم چونکہ کسی حد کا پابند نہیں ہے اس لئے علم کی اہمیت میرے دل سے نکل چکی ہے!"

"لیکن آج کل کے زمانے میں" مسحور نے سارہ کو لاجواب دیکھ کر خود جواب دینا ضروری سمجھا۔ بولی "آج کل تو ان لوگوں کی قدر ہے جو ——"

"جی ہاں۔ میں کیا اتنا نہیں سمجھتا کہ آج کل انجینئر، بیرسٹر، ڈاکٹر اور فلاں فلاں کی قدر ہے۔ یہ لوگ بس پیسہ کما کے آرام سے رہنے کی خاطر ہی پڑھ لکھ گئے نا۔ میں تو ایسے بزنس مین "حضراتوں" کو جانتا ہوں۔ جو اپنے دستخط بھی نہیں کر سکتے۔ جانتے ہی نہیں کہ نام کیسے لکھا جاتا ہے مگر لکھ پتی ہیں۔ تو اب بتائیے کہ پڑھ لکھ کر تیل بیچنے سے یہ اچھا ہے کہ نہیں کہ جاہل رہ کر لکھ پتی بن جائیں!۔ اور اب میں بھی یہی کرنے والا ہوں۔ یا پھر سب سے اچھی ترکیب یہ ہے کہ خوب مالدار لڑکی سے شادی کر لی جائے!" اور مزے میں اپنا گھر بھر لیا جائے۔ مطلب یہ کہ۔ وہ جو کہتے ہیں کہ رنگ چوکھا آئے۔ ارے ہاں۔ مجھ ایسے شریف، حسین اور مہذب نوجوان آج کل ملتے کہاں ہیں؟"

سارہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک گیا۔ جھلا کر بولی "اتنی لمبی تقریر آپ نے کی ہے۔ نری بکواس کوری۔ آپ کو صحیح بات کرنے کی بھی تمیز نہیں آپ نے کہا ہے کہ حضراتوں۔ اللہ توبہ۔ جہالت کی حد ہے۔ آپ کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ حضرت کی جمع حضرات ہوتی ہے۔ کسی اور کے سامنے آپ نے اس طرح گل کترے تو وہ کیا سوچے گا؟"

"انہوں نے اور بھی تو غلط سلط باتیں کیں" مسحور دبی زبان میں بولی "کلکشن کو کنکشن کہا تھا اور اشعار دوں!" "گالیاں بھی دیں بیچ بیچ میں"

"ارے۔ آپ لوگ تو یوں میری باتوں کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہیں کہ جیسے سب سے بڑی بقراط آپ ہی دونوں ہیں۔ واہ بھئی ——"

ہشام سخت حقارت سے ہنسا: زبان میری، گفتگو میری۔ جو میرا جی چاہے بولوں۔ آپ لوگوں کی مرضی۔ سنئے! اب میں ناپ تول کے بولنے سے تو رہا!

مسحور کو اس وحشی جنگلی جاہل اور کھردرے آدمی سے بڑی شدید دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ جس قدر سارہ کو الجھن ہو رہی تھی اور اسکا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کمرے سے دفع ہو۔ مسحور کا دل چاہ رہا تھا کہ جتنی دیر بیٹھے اسی قدر اچھا ہے۔ وہ ہشام کی الل ٹپ بکواس مزید سننے کی خاطر بولی:

"آپ کہہ رہے تھے کہ اچھے اشعار آپ کی کمزوری ہیں۔ تو پھر سنائیے نا ہمیں بھی چند شعر۔ میرے مجموعہ میں اضافہ ہو جائے گا!"

"مسحور، تم بیکار وقت ضائع کر رہی ہو" سارہ نے احتجاج کیا۔

"بھئی شعروں کی بات آجائے تو تم جانتی ہو کہ میں ضبط نہیں کر سکتی۔ کیا حرج ہے اگر چند شعر سُن ہی لیں!" مسحور نے کہا:

سارہ کی بیزاری نظر انداز کر کے ہشام نے مسحور سے پوچھا: فرمایئے۔ فلمی شعر سناؤں کہ غیر فلمی!

فلمی بھی آپ نے از بر کر رکھے ہیں" سارہ نے بڑی حقارت سے کہا۔

ہائے نہیں۔ فلموں کا نام بھی میرے سامنے مت لیجئے۔ میں فلموں سے الرجک ہوں" مسحور نے کہا: عرصے تک کے لئے سر کا درد لے کے پڑ جاؤں گی"

کیوں۔ کیوں۔ لطیفے تو بہت پر اثر ہوتے ہیں" ہشام نے کہا"

مثلاً کسی فلمی شاعر کا یہ شعر ہے

تو سولہ برس کی

میں سترہ برس کا

چھی چھی چھی۔ توبہ" مسحور نے ابکائی لے کر کہا: دیکھیے۔ مجھے متلی ہو جائے

گی!" مجھ پر رحم کیجئے"

"آپ سمجھیں نہیں۔ اس شعر کو ہمیشہ گنگناتے رہنے سے یہ بھی فائدہ ہوتا ہے کہ آدمی خود کو سترہ برس کا اور عورت خود کو مرتے دم تک سولہ برس کی سمجھتی ہے۔ ان پر بڑھاپے کا حملہ نہیں ہوتا اور وہ ساٹھ اور ستر برس کی عمر میں بھی جوان اور تندرست رہتے ہیں۔ میں نے ابا جان اور امی جان کو اکیلے میں یہ گیت گاتے سنا ہے!"

"دشمن۔ جھوٹے۔ بکواسی!" ساجدہ بولی۔

"ادب سے۔ ادب سے" ہشام نے للکارا! "یہ میرے والدین کی جوانی کا مسئلہ ہے"

"توبہ۔ کدھر کی بکواس چھڑ گئی" مسعودہ بولی "ارے۔ آپ شعر سناتے ہیں تو سنائیے۔ ورنہ اپنا راستہ لیجئے!"

"قلم کاغذ سنبھالئے۔ میں سناتا ہوں۔ آپ لکھتی جائیے!"

"ہاں ہاں آپ سنائیے" مسعودہ نے بڑے اشتیاق سے کہا "میں زبانی یاد کرلوں گی!"

"اچھا صاحب۔ سنئے!" ہشام نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ اور بولا "آپ کو اقبال کے شعر اچھے لگتے ہیں کہ نہیں؟"

"یہ لیجئے بھلا اقبال صاحب کے شعر بھی کسی کو ناپسند ہو سکتے ہیں" مسعودہ نے کہا۔ ساجدہ جھنجلائی ہوئی خاموش بیٹھی تھی۔ اسے تو ان دونوں کی چخ چخ بھی قطعی ناگوار لگ رہی تھی۔ مگر مسعودہ مہمان تھی وہ کیا بولتی؟"

"تو پھر سنئے"

خوش ہو کر ہشام نے کہا۔ ے

اے دل ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا۔

سارہ کو غصہ کچھ نکلنے لگا! مسعود نے البتہ داد دی۔ اب وہ کچھ اسے اُلّو بنانے پر اتر آئی تھی۔ وہ سنجیدگی جو اس کی فطرت تھی۔ اس نے اسے بھی طلاق دے دی اور واہ واہ کر کے بولی :

اچھا۔ اور۔ کوئی۔!"

آپ کو پسند آیا؟" دلشاد خوش ہو کر ہشام نے پوچھا۔"

کیوں نہیں!"

میری کاپی میں ایسے عمدہ عمدہ شعر ہزاروں ہیں" وہ بولا۔"

کاپی نہیں۔ اسے بیاض کہتے ہیں" مسعود نے اس پر ترس کھا کر تصحیح کی!

کب تک ان سے سر مارو گی؟" سارہ نے جل کر کہا۔"

ننھا بے چارہ قالین ہی پر سو گیا ہے۔ تم اسے باجی کو دے آؤ۔ میں تب تک ان سے دو چار شعر اور سن لوں" مسعود ہنس رہی تھی!"

ہاں ہاں ضرور۔ سنئے" ہشام نے ایک خاصے ترنم سے پڑھا :-

یا رب، دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

ایسی کی تیسی" سارہ چیخی۔ اور بولی" اچھی بات ہے۔ تم کو اگر یہ بکواس اچھی لگ رہی ہو تو سنو۔ میں تو چلی" اس نے جھک کر ننھے کو بانہوں میں سنبھالا اور باہر نکل ہی رہی تھی کہ دالان سے ایثار کی بھاری آواز آئی۔

"اُو۔ بدمعاش!"

ہشام چونک پڑا اور بولا" یہ معزز تخاطب غالباً میری ذات حماد کی

سے ہے۔ اچھا محترمہ۔ باقی پھر۔ آپ کے ذوق کی تسکین کے لئے میں اپنی پوری بیاض آپ کو مرحمت فرما دوں گا۔ اب میں چلا!"

دالان میں ایثار کا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ اسے گھورتے ہوئے آداب عرض کرتا ہوا جناب بے حد خوش اخلاقی سے رکوع کے پیرائے میں جھک کر بولا"

"کیوں ڈینگے، پاجی۔ یہ کیا حرکت ہے؟" ایثار خاصے برہم دکھائی دے رہے تھے"

"کس کیسی حرکت؟" وہ بدحواس ہو گیا اور رحم طلب نظروں سے باری باری اپنے باپ، چچا اور ماں اور چچی کو دیکھنے لگا۔ مگر اس کے لئے رحم یا مروت کسی کی آنکھوں میں دکھائی نہ دیا۔ احمقوں کی طرح پھر ایثار کی طرف منہ اٹھا دیا۔ ایثار نے اپنے خسر محترم کو دیکھا اور ان سے بولے: "پوچھئے قبلہ!"

"میں کیا پوچھوں؟" افتخار صاحب نے سخت بیزار ہو کر کہا "ناقابل برداشت ذلتیں ہیں۔ تم ہی پوچھو اور جواب طلب کر دو!"

"کھال ادھیڑ دو۔ الو کے پٹھے کی!" ابصار صاحب یعنی ہشام کے ڈیڈی بولے"

ہشام نے جب دیکھا کہ یہاں اس کے قتل کے سامان ہیں تو بھاگ کر پھوپھی کے پیچھے چھپ گیا اور دانت یوں بجانے لگا جیسے جاڑا لگ رہا ہو۔!"

پھوپھی نے سمجھایا "بیٹے۔ تم کو ضرورت تھی تو پیسے مانگ لیتے۔ تم نے یہ کیا حرکت کی کہ اپنے استاد سے پوری فیس دھر والی۔ نہ ان سے پڑھا نہ لکھا۔ وہ ایثار کے دوست تھے ان سے شکایت کر رہے تھے کہ تم نے ان سے نہایت اوٹ پٹانگ بکواس کی تھی۔ عجیب نرالے ہو تم۔ اتنا بھی نہیں

سمجھئے کہ اب یہ باتیں تم پر زیب نہیں دیتیں ! "

ہنسی ضبط کرنے میں ہشام کا گلا دُکھنے لگا ! ۔ مگر مجبور تھا ۔ اسے درجنوں آنکھیں گھور رہی تھیں ۔ اس کا جرم ناقابل معافی تھا ۔ ایک بھی دانت دکھائی دے جاتا تو بقول بھابی کے اس کا قتل عام یقینی تھا ۔ لہٰذا نہایت بے کسی سے اس نے گردن جھکالی اور بڑی نسائیت سے جرکن کا کونہ مروڑنے لگا ! "

"میں نے تو بھر پایا صاحب" الہٰ دار صاحب نے کہا " آپ لوگ جانیں یہ مردود جانے ۔ میں تو اپنی بچیوں کو اپنے ہونہار بیٹے سمجھتا ہوں " یہ کہہ کر وہ چلے گئے ! "

"بڑے افسوس کی بات ہے ۔ ہشام ۔ تم نے ڈھائی سو روپے کیا کئے ؟ " منصور نے پوچھا "

اسی وقت سامرہ اور مسعود بھی کمرے سے باہر آئیں ۔ سوئے ہوئے بچے کو سامرہ نے باجی کی گود میں دے دیا اور دونوں وہیں بیٹھ گئیں ۔ جیسے ہشام کی دُرگت سے محظوظ ہونا چاہتی ہوں ۔ بس ۔ ایک قیامت نے سر اٹھایا ۔ ہشام نے اطمینان سے کہا "

" بھائی جان ۔ قسم لے لیجئے جو ایک کانی کوڑی بھی میں نے اپنی ذات پر خرچ کی ہو ۔ سامرہ کہنے لگیں کہ مسعود بیگم آنے والی ہیں ۔ وہ مفت کے پیسے مجھے دے دیجئے ۔ اب میں ان کا دل کیا توڑتا ۔ ایمان سے کہتا ہوں ۔ پورے ڈھائی سو گن کے انہیں دے دئے کہ بے چاری بچیاں ایک ایک پیسے کو ترستی ہیں ۔ اچھا ہے کچھ گیہوں دودھ کھا پی لیں ۔ سینما دیکھ کر سبق حاصل کریں "

سامرہ بھونچکا تھی ۔ مارے غصے کے اس کی گویائی ہی سلب ہو گئی ۔ البتہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ چنانچہ ہشام کو صدفی صد سچا سمجھ کر ریشاں نے کہا "

خیر۔ ملکہ۔ تم نے ان سے کچھ پڑھا کیوں نہیں؟"

سارہ کو روتے دیکھ کر منصور نے سمجھا کہ وہ شرمندہ ہے لہٰذا وہ بھی مصنوعی کھانسی کھانس کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے!"

ایثار کی طرف مڑ کر ہشام نے بڑی روانی سے کہا: "دولہا بھائی آپ نے بھی کس چیپٹر قناتی کو بھیج دیا تھا۔ ارے انھوں نے تو عجیب واہیات باتیں پوچھنی شروع کر دیں صاحبزادے آپ کے والدین نے سنا ہے کہ بڑے تیز مزاج ہیں آپ۔ کی امی کو مارتے پیٹتے تو نہیں۔ آپ کے بہنوئی دو دو مہینے تک آپ کی بہن کو میکے میں کیوں چھوڑ دیتے ہیں۔ کیا آپ کے باپ کے پاس کھانا بہت ہے۔ اور آپ کی خالہ ــــــ"

"لاحول ولا قوۃ، اس نے ایسی باتیں کیوں کیں؟" افتخار صاحب بولے۔

"تعجب ہے" ایثار نے بھی منہ بنا لیا "حالانکہ خاصے سمجھدار اور بھلے آدمی ہیں"

"کوئی میں اس کے باپ کے گھر کا کھانا کھا رہی تھی" باجی چیخیں "لو اور سنو۔ گھر کے داماد کو بہکانے کی باتیں ہیں کہ نہیں۔ وہ کون مُوا مونڈی کاٹا تھا۔ میں سُن لیتی اس کی باتیں تو پھر دیتی مزے کے جواب۔ جھاڑو پھرا منحوس!"

"وہی مردود مارتا پیٹتا ہوگا اپنی بیوی کو۔ لاحول ولا قوۃ۔ طالب علموں سے ایسی باتیں" افتخار صاحب نے کہا۔

اس کی صورت کو لوکا لگے" چچی اماں بھی جھلائیں "نگوڑا مردے نکالا سکھا رہا ہے کہ بیوی کو پیٹو۔ جاہل کہیں کا۔ نامراد!"

"اب صورت حرام کو اس گھر کی چوکھٹ اُلانگنے نہ دینا" پھوپھی کا پارہ بھی گرم ہو گیا!"

سب کے سب ماسٹر صاحب کی غائبانہ ترکا بوٹی کرتے رہے۔ منصور اور

ایثار تو شرمندہ ہو رہے تھے۔ اس چپقلش کا فائدہ اٹھا کے ہشام چپکے سے باہر کھسک گیا۔!!!

موسم تبدیل ہونے لگا تھا۔ گرمی اپنی تیزی دکھا کے رخصت ہو رہی تھی۔ برسات اپنے ساتھ درختوں کے لئے چمکیلی خلعت اور کلیوں کے نکھر کر بکھرنے کے لئے خوشنما مسکراہٹ لے کے آ رہی تھی۔ دن بھر ہلکے ہلکے بادل چھائے رہتے۔ لطیف خنک اور نم ہوا ایسی یہاں وہاں ارغنوں بجاتی پھرتی تھی۔ غیر محسوس سی پھوار پڑنے لگتی اور فضا بھیگی بھیگی نظر آتی!۔ اپنی پچھلی خیر سامانی پر نادم و پشیمان سورج نے نقاب ابر میں اپنا غصیلا چہرہ مدت تک کے لئے چھپا لیا تھا!!

شعر و سخن کی متوالی، رومانی ماحول کی دلدادہ مسحور ایسے ہوشربا موسم میں گھر پر ٹک ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنے گھر ہوتی تب بھی خادمہ کو ساتھ لیکر میوزیم کے پارک میں جا بیٹھتی! اور خوب اچھی طرح موسم کی دلکشی کا لطف اٹھاتی۔

پچھلی رات سے موسم یکبارگی تبدیل ہو گیا تھا۔ ہلکی پھوار مسلسل برس رہی تھی۔ آسمان پر کالے رنگ کے بادل دیو کی مانند ہوا کے دوش پر سوار اڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس بھیگے ہوئے ماحول میں مسحور بے تاب ہونے لگی!!

کچھ دیر تک برآمدے میں کھڑی وہ باغ کے اونچے اونچے درختوں کو ہواؤں کے غیظ و غضب کے سامنے رکوع و سجود کرتے دیکھتی رہی۔ ابر آلود آسمان کے نیچے گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ ہلکی بارش کا تسلسل قائم تھا۔ فاختئی بادل نہ ختم ہونے والی قطار میں اڑتے دکھائی دے رہے تھے!۔ اکثر ہوا کی سرکشی انہیں منتشر کرتی اور ذرا سی دیر میں وہ پھر اکٹھا ہو کر کوئی خوفناک شکل اختیار کر لیتے

اپنے کمرے سے سائرہ نکلی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی دو پیالیاں تھیں۔
چاپ سن کر مسحور نے رخ موڑا:
"کافی!" سائرہ مسکرائی:
پیالی لے کر مسحور منڈیر پہ ٹک گئی۔ سائرہ نے اسٹول گھسیٹ لیا۔ اور بولی۔
"ادھر کیوں بیٹھ گئی ہو بھئی۔ ہوا اڑ رہی ہے۔ ویسے ہوا کا ایک تیز جھونکا تمہیں نیچے پھینک دے گا!۔ ادھر آجاؤ۔ کرسی پر!"

"ارے میں تو سوچ رہی ہوں کہ خالہ بی سے اجازت لے کر باہر جاؤں۔" مسحور بولی: "تم جانو کہ جب بارش نے تہلکہ مچا رکھا ہو۔ ہوائیں چیخ رہی ہوں اور بادل کی دھاڑ زمین کی بنیاد ہلا رہی ہو۔ بجلی کی چمک سے نظریں خیرہ ہو رہی ہوں تو میں گھر میں گھس کے نہیں بیٹھ سکتی۔ میں نے ایسا ہوشربا موسم ہمیشہ کسی چمن میں گزارا ہے۔"

"تم پاگل ہوئی ہو مسحور؟ امی ہرگز باہر نہ جانے دیں گی۔" سائرہ بولی۔
"وہ تو بجلی بادل کی وجہ سے ادھر کی کھڑکیاں تک بند کروا دیتی ہیں۔ بجلی سے امی کو بے حد ڈر لگتا ہے۔"

"پوچھیں تو۔" مسحور نے کہا۔
"جاؤ پوچھ آؤ۔ میں تو جھڑکی کھا کے احمق بننا پسند نہیں کرتی!"
"تم بتاؤ تم تو نہیں ڈرتیں نا!"
"کچھ کچھ!"
"تو پھر اجازت لے آؤں؟"
"آیۃ الکرسی پڑھ کے جاؤ!"
"کیوں!"

امّی اور چچی جان دونوں غصّے میں بھری بیٹھی ہیں۔ آج کو دولھا بھائی سے ملنے کے لئے ماسٹر صاحب آئے تھے۔ انہوں نے ہشام صاحب کی خوب شکایتیں کیں! پتہ نہیں اُن سے کیا کیا حماقتیں سرزد ہوئیں۔ ارے نمبر ایک کے جھوٹے کمینے ہیں ہشام بھائی۔ مجھ پر بھی الزام لگا دیا تھا کہ میں نے ان سے ڈھائی سو روپے لئے۔ میں کچھ ایسی فقیرن تو نہیں تھی۔ میں نے بھی چچا جان سے کہہ دیا تھا کہ وہ قطعی جھوٹ بول رہے ہیں۔ اللہ توبہ۔ مسحور، تم دیکھتیں تماشہ۔ ایک طرف سارا گھر تھا اور دوسری طرف اکیلے وہ جھوٹے بدقماش صاحب۔ گھگھی بندھی تھی۔ قریب تھا کہ چچا اور دولھا بھائی چمڑی ادھیڑ دیتے۔ مگر پھوپھا ابّا نے بچا لیا۔ اپنی طرف لے کے چلے گئے!"

"تو اس میں خالہ بی اور چچی جان کے غصّے کی کیا بات ہے؟" مسحور نے کہا۔

"ارے یہ چچی جان ہی کے تو بیٹے ہیں،" سامرہ نے جواب دیا۔ "ویسے امّی اور ڈیڈی نے انہیں ہم سب کے ساتھ پالا پوسا ہے۔ سُنا ہے کہ ان کی پیدائش میں چچی جان خوب بیمار پڑی تھیں۔ لہٰذا امّی نے انہیں لے لیا۔ اور پھر وہ ہم ہی لوگوں کے ساتھ پلے بڑھے۔ ان کی ان ناقص حرکتوں کی وجہ سے امّی سمجھتی ہیں کہ انہی کی تربیت میں کوئی خامی رہ گئی ہے۔ بس غصّے ہو جاتی ہیں!۔ اس وقت تو سچ مچ جوتی اٹھا کے لپکی تھیں!"

"توبہ اتنی بڑی عمر میں انہیں خود سے چھوٹوں کے سامنے پٹتے بُرا نہیں لگتا؟" مسحور نے حیرت ظاہر کی!۔ سامرہ نے بُرا سا منہ بنایا اور زیادہ بُرائیاں کرنے لگی!" مسحور جی لگا کر سامرہ کے ملفوظات سُن رہی تھی۔ دفعتاً اسکی نگاہیں ٹین کے پارٹیشن کی طرف اُٹھ گئیں۔ اور وہ سچ مچ اچھل پڑی!"

پارٹیشن پر دونوں بازو رکھے بڑے اطمینان سے ہشام اُدھر جھانک رہا اور انکی

باتیں سُن رہا تھا!"

مسعود کا چہرہ گلابی ہو گیا!۔ البتہ سارہ بھبک اٹھی۔

"لڑکیوں کو جھانکتے شرم نہیں لگتی!" سارہ نے کاٹ کھایا۔

"میں تو سُن رہا تھا کہ میری تعریفیں کر کر کے آخر تم کتنا ثواب کماؤ گی۔" مگر تم نے اپنے ثواب میں ان مخترمہ کو بھی ساجھے دار بنا لیا ہے۔ یہ البتہ بُرا کیا!"

"صبح ہی کو ڈنڈے برستے پڑتے رہ گئے" سارہ بولی۔ "مگر غیرت تو نام کو بھی نہیں۔ پھر ویسے ہی چکنے گھڑے بن کر اپنی حرکتوں پر اُتر آئے!"

جانے کیا بات تھی۔ جتنی سارہ کو ہشام سے چڑھ اور جلن لگتی۔ اتنا ہی مسعود اس کی ذات سے دلچسپی لیتی!" اب بھی وہ مسکرا رہی تھی۔ پھر بولی۔

"آپ نے جھانکنے کی حرکت البتہ بری کی۔ شرافت سے آکے بیٹھ جاتے؟"

ہشام نے ہاف ڈور کھول کر قدم بڑھایا اور نہایت تمیز سے پوچھا "اب آکے بیٹھ جاؤں شرافت سے؟"

کوئی ضرورت نہیں!" سارہ بولی۔

ارے ہاں" ہشام یکبارگی چونکا اور جیسے کچھ یاد کر کے جلدی سے کہا۔ "بچئے۔ میں تو بھول ہی جاتا۔ ان بکواسی مخترمہ کی کم بختیوں میں ناممکن ہے کہ کوئی بات ڈھنگ سے یاد رہ جائے۔ مجھے ـــــ!"

آپ کی خود کم بختیاں" سارہ نے کہا۔

سنئے تو وہ ہشام صاحب کیا کہہ رہے ہیں" مسعود نے دخل دیا۔

جیتی رہیئے!" ہشام نے خوش ہو کر مسعود کو دعائیں دیتے ہوئے کہا "یہ آثار ہیں پھلنے پھولنے کے۔ اللہ آپ کو صاحب نصیب کرے۔ اچھا گھر ملے۔ دولہا گورا چٹا پڑھا لکھا ـــــ!"

مسعود نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید دعائیں دینے سے روک دیا: "شکریہ۔ اتنی ہی کافی ہیں۔ آپ اپنی بات مکمل کیجئے!"

"ہاں وہ" ہشام نے کہا: "چچی اماں مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ موسم بے حد سہانا اور دلکش ہو گیا ہے۔ لڑکیوں کو نیشنل پارک کی سیر کرا لاؤ۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مجھے پچیس روپے بھی دئے تھے۔ مگر میں تو فی الحال ضرور تنہا جانا چاہتا ہوں۔ میں آپ لوگوں کا باڈی گارڈ بن کر نہیں جا سکتا۔ آپ لوگ یہ روپے لیجئے اور جائیے!" اس نے جیب سے پچیس روپے نکالے اور کسی کے ہاتھ میں دینے کے بجائے کرسی پر ڈال دئے۔

"بالکل جھوٹ ہے" سارہ بولی: "امی غصے میں بھری بیٹھی ہیں۔ وہ بھلا روپے دیں گی۔ اور ان حضرت کو دیں گی؟ ابھی ابھی تو مار مار کے دوڑا رہی تھیں!"

"امی کا غصہ کیا؟" ہشام نے کہا: "ابھی ہے ابھی نہیں۔ بھلا ان کا بھی کوئی غصہ ہوتا ہے!" پھر وہ تاکیداً بولا: "ارے تم کو جانا ہو تو جاؤ۔ ورنہ میں یہ روپے چچی اماں کو واپس کئے آتا ہوں۔ خواہ مخواہ یہ تو تمہیں ہم جیسے اور مغرور مردوں کو ایسے واہیات کاموں میں الجھا دیتی ہیں۔ [illegible] اس سے پہلے۔ فلاں تک یہ بات پہنچا دو!"

سارہ بڑبڑانے لگی۔ مگر مسعود کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا اور جلدی سے بولی:

"چچی سارہ۔ بس اب نکل چلو۔ پھوار بھی بند ہو چکی ہے۔ اور آسمان ذرا رہا ہے کہ خوب برسے گا!" "ایسا نہ ہو کہ کہیں ہمیں پانی آ لے۔" "ہشام صاحب کیا آپ سچ مچ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گے؟"

"قطعی نہیں!" ہشام نے کھردرے لہجے میں کہا: "میں دوست کے ساتھ فلم دیکھنے

جا رہا ہوں۔ لیکن آپ سے استدعا ہے کہ اگر چچی اماں آپ سے پوچھیں تو براہ کرم یہی کہیے گا کہ جی ہاں ہشام صاحب ہمارے ساتھ تھے۔!!

"اچھا اچھا!" مسعود چہکی۔ اور سامرہ کو جھنجھوڑ کر بولی "بس اب چلو اٹھو۔ خواہ مخواہ تم ڈری جا رہی تھیں۔ اب دیکھو۔ خالہ بی نے خود ہی ہمارے دل کی آواز سن لی۔ اٹھو بس۔ سہ پہر تک آجائیں گے۔ نیشنل پارک دور ہی کتنا ہے بہت سے بہت آتے جاتے رکشا کا کرایہ پانچ روپے ہوگا۔ بیس روپے چائے پانی کے۔ بہت ہیں اور کیا۔ اللہ میری خالہ بی کتنی اچھی ہیں!"

"اچھا میں چلا۔ السلام علیکم!" ہشام نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک کر بڑے ادب سے دونوں کو سلام کیا اور الٹے قدموں چلتا پارٹیشن کے پیچھے غائب ہو گیا!"

ان کی اس حرکت نے دونوں کا موڈ خراب کر دیا۔ آخر وہ ذرا سا بچہ اور انہیں بزرگ کیوں سمجھتا تھا!"

مسعود نے روپے اٹھا کر اپنے پرس سے رومال نکال کر باندھ لئے۔ سامرہ پہلے تو ٹھٹکی پھر آمادہ ہو گئی۔ اور دونوں باغ کی راہ اتر گئیں!"

نیشنل پارک بڑی دور نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے ساتھ تھرماس لے لیا تھا وہ راستے میں کافی سے بھروا لیا۔ لیکن پھر رکتے ہوئے بادام خریدے اور اطمینان سے باغ میں جا بیٹھیں!" سامرہ کے ساتھ ابن صفی کا ایک ناول "عمران کا اغوا" تھا۔ وہ ایک گھنے درخت کے نیچے بیٹھی اپنا پسندیدہ ناول پڑھتی اور ہنستی رہی!"

مسعود کا حال خراب تھا۔ وہ تو ناولوں کی رومانی انگریزی میں کھو کر جیسے ماحول ہی کا حصہ بن گئی تھی۔ درختوں کے نیچے رومانی اندھیرا چھا رہا تھا۔

جیسے آسمان کا کوئی ٹکڑا وہاں جھک آیا ہو۔ دوپہر کی مرطوب ہوا میں سبزے کی مہک رچی بسی تھی۔ بڑا کیف زا ماحول تھا۔ مسحور سچ مچ مسحور سی بیٹھی دور دور نگاہیں دوڑا رہی تھی اور طائر خیال بھی جانے کہاں کہاں محو پرواز تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی وہ اُداسی اور قنوطیت جو اس کی شخصیت کا جز بن چکی تھی اب کہیں تحلیل ہو گئی تھی۔ وہ خود کو ہلکی پھلکی محسوس کر رہی تھی۔ خیالوں کی دنیا میں کوئی سا عجیب انقلاب آ گیا تھا۔ جب وہ اپنے گھر میں تھی۔ یوں سوچ رہی تھی کہ اسے خالہ کے گھر جانا اور جانے کب تک رہنا ہے۔ اپنے ماں باپ کو ایک طویل عرصہ تک خود سے جدا محسوس کرنا بڑا کرب انگیز تھا۔ وہ انہیں رخصت کرتے اور یہاں آتے وقت خاصی دیر تک رویا کی تھی!؟ اور دل پر بڑا جبر کر کے یہاں آئی تھی!؟ لیکن۔ اب۔ وہ گم صم سی سوچے جا رہی تھی۔ یہ گھر اور اس گھر کے مکین اسے اتنے اچھے کیوں لگ رہے تھے!؟

سوچتے سوچتے وہ چونک سی پڑی۔ جیسے سوچ کے صاف اور سیدھے دھاگے میں کہیں گرہ اٹک گئی ہو۔!؟

گھر کے سب مکین اچھے لگے تھے کہ صرف ایک فرد۔؟ اس نے گھبرا کر سامرہ کو دیکھا۔ وہ بدستور کتاب میں غرق تھی۔ مسحور نے اطمینان سے ڈوڈ نیا کی باڑھ سے پیٹھ ٹیک دی۔ ایک غیر مانوس سی ٹھنڈک اور سنسنی اس کے جسم میں سرایت کرنے لگی!۔ اس نے پلکیں بند کر لیں۔ پھر تو جیسے بند آنکھوں کے سامنے ایک صاف شفاف اسکرین تن گیا۔ اس پر ایک چہرہ جگمگانے لگا۔ شرارت سے چمکتی آنکھوں اور متبسم لبوں والا چہرہ۔!

عجیب سی بات تھی۔ سارا گھر لٹھ لئے اس کے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ اس کی عادتیں کسی کے لئے پسندیدہ نہ تھیں۔ مگر اسے تو اس کی ایک ایک ادا پیاری لگتی تھی۔

شرارت سے تنہا، چھوٹوں کو چھیڑتا ستاتا، بڑوں تک کو چٹکیوں میں اڑاتا تھا۔ سب کے لئے اس کی جہالت اور ناشائستگی عیب اور خامی تھی۔ لیکن مسحور سمجھتی تھی کہ وہی اس کی شخصیت کا حسن تھا:۔ بے خبری، لاعلمی اور جہالت کی معصومیت۔ جو کچھ جانتا بوجھتا نہیں تھا۔ جسے کسی بھی زبان کے ادب کا پتہ نہ تھا۔ جو اپنی بے خبری کے خول میں محصور عجیب سی قلندرانہ زندگی گزار رہا تھا اور یہ سب کچھ مسحور کے لئے بڑا پرکشش تھا۔ اس کی نظروں سے ابھی تک بزعم خود بڑے بڑے ڈگری ہولڈر گزرے تھے۔ اس کے چچا زاد اور دوسرے رشتے دار بھائی جو اس کے باپ سے ملنے آتے تھے۔ بہت پڑھے لکھے تھے۔ بڑی انکساری اور خاکساری سے تذکرہ کرتے تھے کہ کسی نے پچاس ہزار ڈونیشن دے کر میڈیسن لائن اختیار کی تھی۔ کوئی کہتا تھا کہ تیس ہزار دے کر انجینئر لائن جوائن کی ہے۔ وہ لوگ بڑی ادق زبان میں اپنی علمیت کی دھاک جمانے تھے!۔ اور کسی حد تک مسحور بھی ان سے مرعوب و متاثر ہو جاتی تھی!۔ سمجھتی تھی کہ قوم کی اگلی خوشحالی انہی کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ قوم کے معمار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جن کا دعوٰی ہے کہ وہ غریبوں کے مفت علاج کے لئے ڈاکٹری پڑھ رہے ہیں۔ مسحور کے دل میں انکی عقیدت و محبت کے قطب مینار ایستادہ ہو جاتے۔ کتنے ایثار پسند اور درد مند دل کے مالک ہیں بے چارے۔ غریبوں کے لئے انہوں نے اتنا کثیر سرمایہ خرچ کیا ہے۔ اب دنیا بھر کے غریب ان کے در کے سامنے قطار باندھے کھڑے رہا کریں گے!۔

اور یہ انجینئر صاحب۔ وہ بیرسٹر صاحب، فلاں فلاں۔ جو قوم و ملک کی ترقی و بہبودی کے بہلانے اپنے اپنے مستقبل کی تعمیر میں کوشاں تھے!

اونچی اونچی سندیں حاصل کرنے والے بے چارے سے جارہے تھے

اپنے مفلس قلاش بھائیوں کا دکھ دل و جان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا!"

لیکن وہ ۔ آپ اپنا جواب تھا۔ ایک تعلیم یافتہ مہذب گھرانے کا فرد ۔ جس کی دنیا ہی الگ تھی۔ اور وہ مسحور کو بے حد اچھا لگتا تھا"

انہیں پارک میں آئے ہوئے کافی دیر گزر چکی تھی"

سائرہ نے کتاب بند کر کے الگ رکھ دی اور مسحور کو آواز دی "کہاں گم ہو گئے ابھی نہیں گئے! اب تمہارا پسندیدہ موسم بھی کھل گیا ہے۔ لوگ یہاں آنے والے ہیں۔ پھر شام داخلے کے لئے کھل جاتا ہے۔ کیا خیال ہے۔ گھر چلو گی کہ ابھی پوری طرح اکتائے نہیں کیا؟"

کم سے کم بھائی ۔ مسحور نے ہنستے ہوئے کہا "اگر نہیں چلیں گے تو کیا یہیں گھر بنانا ہے!"

وہ لوگ منہ ہی منہ سے کافی پیتے رہے!"

ان کے گھر پہنچ جانے کے بعد ہشام نے ان کی روانگی کی اطلاع خواتین کو پہنچائی ۔ صورت بنا کے ماں اور بجی کے پاس گیا اور منہ لٹکائے کھڑا ہو گیا۔ چچی جان نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا"

"کیوں آئے ہو ۔ بے ایمان کہیں کے۔ کہا تھا میں نے کہ رات تک تمہاری شکل نہ دکھائی دے!"

اس نے بڑی ڈھٹائی سے کہا "جی ہاں۔ جی ہاں۔ چور، بے ایمان دغاباز فقط ایک میں ہی ہوں۔ آپ اپنی لاڈلی صاحبزادیوں کو کچھ نہیں کہتیں۔ بھلا غضب خدا کا ہے کہ موسم ایسا جل تھل ہو رہا ہے۔ مردوے تک چیل کووں کی طرح اپنے اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے ہیں۔ میرا خود بھی بجلی پانی سے جی ہول رہا ہے۔ مگر وہ دیدہ دلیر لڑکیاں گھر سے باہر تفریح فرمانے چلی گئی ہیں!"

"کون؟ سینا اور صدف؟" باجی نے پوچھا "ان سے ہزار بار کہا کہ ایسے

موسم میں باغ میں نہ جایا کریں!"

"باجی جان۔ ہم تو یہاں بیٹھے کامک پڑھ رہے ہیں" مسعود نے ایک گوشے سے آواز دی۔

"ان بے چاری بچیوں کے کان نہ مروڑا کیجئے باجی" [illegible] ان [illegible] کی بھی خبر لیا کیجئے جو آپ کے نزدیک ایک [illegible] حکم پر سانس لیتی ہیں!"

"ارے تو بکو بھی تو کچھ!" چچی جان چیخیں۔

"مسعود اور سارہ پارک گئی ہیں" ڈانٹ [illegible] سے کہا "ہزار میں نے منع کیا کہ ہمارے گھر کی [illegible] کریں۔ مگر توبہ کیجئے۔ آپ ہی لوگوں کو وہ خاطر [illegible] میاں نے ان کی ضد سے مجبور ہو کر کہا تھا کہ اچھا چلو میں [illegible] کسی جہاندیدہ مرد کا ساتھ ضروری ہے۔ مگر وہ [illegible] منظور [illegible] باڈی گارڈ بن کر ساتھ رہو گے تو تفریح میں خاک لطف آئے گا! [illegible] چپ ہو رہا۔"

"ارے نکمے کاہل الوجود" باجی گرجیں "اب کیا سنا رہا ہے۔ تبھی آ کے کیوں نہ کہا۔ مسعود کی ذمہ داری امی پہ ہے۔ خالہ جان [illegible] کر ان کی بچی کو اچھے برے سے روکنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔"

"یہ مسعود اور سارہ اتنی بے بکی اور [illegible] ہوئیں" امی [illegible] ہاتھ مار کر دانت پیس کر کہا "اور اتنی سر پھری چھوکری لو کیا کہوں۔ [illegible] لحاظ ہے نہ باوا کا ڈر خوف ہے۔ جو چاہتی ہے کرتی ہے۔ [illegible] جا کے لائے کم بختوں کو۔! میرا جان تو عجیب عذاب میں ہے۔ باوا سے

کہتی ہوں، بس بہت پڑھ لکھ چکیں اب اچھا رشتہ ڈھونڈ کے ہاتھ پیلے کر دو تو جواب
دیتے [redacted] تمہارا زمانہ نہیں ہے کہ بس تیرہ چودہ سال کی لڑکی کے ہاتھ پیلے کر کے
کسی قصائی کے حوالے کر دیا جائے۔ زمانہ بہت خراب ہے۔ پہلے انہیں اتنی تعلیم
حاصل کرنے دو کہ کچھ اونچ نیچ ہو جائے تو کم از کم اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکیں۔
خدا غارت کرے۔ کیا زمانہ آن لگا ہے۔ لڑکیاں اپنے پیروں پر کھڑی ہونے
لگیں۔ اے میں کہتی ہوں غارت ہٹی ناس گئی لڑکیوں کے لئے کون سی جگہ
محفوظ ہے۔ عزت و آبرو تو ہر جگہ خطرے میں ہے۔ بلا سے شوہر ظالم ہو تو ہو۔
عزت سے تو اپنے گھر میں رہیں گی۔ مگر بادا جان ہی کی سمجھ پر پتھر پڑے ہیں تو
کوئی کہاں تک اپنا سر پھوڑے ؟"

"اماں رمضانی کو بھجوایئے۔ جا کے بلا لائے" باجی نے بھی ناگوار لہجے میں
کہا "یہ ابر پھر آ رہا ہے۔ بارش ہونے لگے گی۔ کیسے پہنچیں گی گھر تک۔ سچ مچ
بہت ڈھیٹ اور بے جگر ہو گئی ہیں۔ اچھا آنے تو دو۔ دیکھنا کیسی خبر لیتی
ہوں"

"کسے کم پوچھتیں تو!" چچی جان نے کہا۔

"آپ سے کیا پوچھتیں" ہشام نے ٹکڑا لگایا "میں ہی نگوڑا اُن سے بڑا
ناک لاکھ کہہ رہا ہوں کہ نامرادی یہ موسم باہر نکلنے کا نہیں۔ مگر وہ موئنڈی کاٹیں
سنیں تو"

"اچھا تم چپ رہو!" باجی نے گھرکی دی۔ پھر نیلی پیلی آنکھیں نکالیں "
میں کہتی ہوں لڑکے۔ یہ تو نے عورتوں کی طرح نگوڑے سگوڑے کہنا کہاں سے
سیکھ لیا ہے۔ باہر اپنے دوستوں میں کہیں منہ سے نکل گیا تو کتنی شرمندگی ہوگی"
"کئی بار نکلا تھا منہ سے" ہشام بولا "سب نے بہت تعریف کی کہ بہت

اچھا لگتا ہے تمہارے منھ سے۔ تو میں نے ــــــ"

پھوپھی اماں اپنی طرف سے آئیں!۔ اور تخت پر بیٹھ کر پاندان اپنی طرف سرکاتی ہوئی باجی سے بولیں: "کیوں۔ بیوی۔ سب خیر صلاّ تو ہے نا تمہارا منھ اترا ہوا لگ رہا ہے۔ آنکھوں کے نیچے بھی سرمئی حلقے پڑ گئے ہیں۔ کہیں بانی لبھنڈ کے دنوں میں ہائے ہُش مت مچا دینا!"

"اللہ پھوپھی اماں": باجی نے کچھ شرما کر جواب دیا: "رات سے جی گھبرا گیا تو ہے۔ مگر یہ میرے بس کی بات کہاں ہے؟ جو خدا کی مرضی!"

"اے ہاں۔ اللہ ساتھ خیریت کے تمہیں فارغ کرے!" پھوپھی نے کہا۔ پھر ادھر اُدھر دیکھ کر بولیں: "یہ لڑکیاں کہاں ہیں۔ ہر وقت کمرے میں گھسی سر سے سر جوڑے کیا باتیں کیا کرتی ہیں۔ اے بی بی ماہرہ۔ آواز دو انہیں!"

"آواز کیا دوں پھوپھی": باجی نے چیں بر جبیں ہو کر کہا: "آپ نے ان کی حرکت دیکھی۔ اس اُتاؤلے موسم میں چلی گئی ہیں تفریح فرمانے!۔ یہاں بجلی کے کڑاکے سے دل ہلا جاتا ہے۔ وہ اس کا تماشہ دیکھیں گی!"

"شتر بے مہار کر دیا ہے انہیں": پھوپھی نے کہا: "ارے تو بھیجو رمضانی کو۔ بلا لائے۔ گئی کہاں ہیں!"

"کیا معلوم؟": چچی اماں نے بڑا سا منھ بنا کر کہا: "کیوں ہشام؟"

"مجھ سے بھلا کیا کہتیں؟": ہشام نے بڑا سا منھ بنا کر کہا: "کوئی میرا ادب قاعدہ کرتی ہیں۔ آپ لوگوں نے دُلار کر کر کے ناس مار دیا ان کو اتنا سر چڑھا لیا ہے کہ وہ مرد بچوں کی بھی اہمیت نہیں سمجھتیں!"

"ہاں بس بیٹے تجھے دلار کر کے کھونٹری پہ نہیں چڑھایا": پھوپھی بولیں: "اچھا

ابّا چھتری لے اور جاکے دیکھ۔ وہ ہیں کہاں۔ بلا کے لا۔ غضب ہے۔
اب ہر دو انیس آتے ہوں گے۔ تین تو بج ہی گئے۔ مجھ کو برا بھلا کہیں گے۔
ہم نے انہیں اتنی آزادی دے دکھی ہے۔ توبہ۔ آج کل کی لڑکیاں بس۔
اپنی ہوں کہ پرائی۔ جو بات ہے کہی جائے گی کہ آسمان میں مرد ادیں مینخ
ٹھونکتی لگی ہیں۔"

"اچھا میں جا رہا ہوں۔ چھٹیاں بیکار کے گھر بیٹھا ہوا الو بن گیا۔" ہشام بولا۔
"خدا کے لئے کم بخت اپنی زبان رہنے دو کہ۔" چچی جان نے شکست خوردہ لہجے
میں کہا۔ "ابھی پرسوں ہی مولائی بوا کی بہو کہہ رہی تھیں کہ ترکاری والی
سے بالکل عورتوں کی طرح لڑ رہا تھا۔ کیا سارے میں بدنام کر رکھا ہے کمبخت نے۔"
"تو پھر اتنی بڑی بڑی موٹی موٹی لڑکیاں ہیں۔ انہیں گود میں تو اٹھا نہیں
سکتا!" ہشام نے کہا۔

"بک بک بند کرو۔ چھتری لے اور جلدی سے جاؤ۔" باجی نے جھگڑا چکایا۔
"واٹر پروف بھی لے لوں۔ شاید پانی آ لے۔" ڈیوڑھی سے ہشام نے پوچھا۔
"تمہاری جہالت کو جھولا لگ گئے۔" باجی نے کہا۔ "اسے پروف کہتے ہیں۔
سنا۔ واٹر پروف!۔ اب یہ کندہ ناتراش کی طرح بکواس نہ کرنا!"
"بھائی میری بولی کا سنسر کر دیا کم بختوں کر اب آپ بھی۔" وہ منہ ہی منہ
میں بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

"سچ کہتی ہوں۔" اس کے جانے کے بعد چچی نے چہرے پر زلزلے کے آثار
پیدا کر کے کہا۔ "کبھی کبھی تو ہمارے ہولے کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ راتوں
کو نیند نہیں آتی۔ سوچتی ہوں کہ اس بے چارے کا دماغ گنواروں کے لٹھ
کا آخر ہو گیا۔ ہم سدا اس کے منہ میں نوالے دینے کو زندہ تھوڑی بیٹھے

رہیں گے۔ کل کو لڑکیاں اپنے گھر در سے لگ جائیں گی۔ یوں بھی ان کا شمار قطار کیا ہے؟ آخر یہ کیا کر کے جئے گا؟ آج کل زندگی کی گاڑی پیسے ہی کے پٹرول سے چلتی ہے۔ اس کے پاس کوئی گن نہیں۔ کوئی ہنر نہیں۔ کیا زہر دے کے سلا دوں؟"

"اوئی خدیجہ۔ تمہاری بھی باتیں"۔ چچی اماں نے ہنس کر کہا "ایسا کون سا قہر ٹوٹا ہے۔ اللہ نہ کرے۔ پچاسوں پڑھے لکھے ہیں! ایک بے پڑھا بھی سہی۔ میں کہوں کہ وہ جو صفت نگر میں ابصار میاں نے نیا مکان لیا ہے۔ وہ ہشام کے نام کر دو۔ کرایہ آتا رہے گا۔ گزر ہی جائے گی کسی نہ کسی طرح"

ہشام چھتری ہاتھ میں لٹکائے واٹر پروف پہنے ایک درخت کے پیچھے کھڑا لمبا سا کھڑا تھا۔ اور بے حد دلچسپی سے دیکھ رہا تھا کہ مسحور اور سارہ کتنی شدت سے انجوائے کر رہی تھیں۔ اس کے دیکھتے دیکھتے وہ کئی بار چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھیں اتریں۔ پھر ننھی بچیوں کی طرح ایک رنگین تتلی کے پیچھے دوڑ ا ئیں۔ ہنستے ہنستے ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ پہاڑی کی یہ سیر ان کے لئے یادگار تھی۔ آفتاب لمحہ بہ لمحہ بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ آسمان کی رنگت ابجوری ہونے لگی تھی۔ ان کا سرخ عکس ننھی ننھی نالیوں میں بہتے پانی پر اس طرح پڑ رہا تھا جیسے اُن میں پانی کے بجائے سرخ روشنائی بہہ رہی ہو۔ کناروں پر بنی بلوری جھونپڑیوں سے دھوئیں کی لکیریں اٹھ رہی تھیں ابر آلود سہ پہر کا یہ منظر کتنا خوشگوار اور فرحت انگیز تھا۔ خود ہشام کی پلکیں مندنے لگیں؟ پھر وہ سنبھل کر کھنکھارا۔

لڑکیاں چونک کر ادھر متوجہ ہو گئیں۔ ہشام کو دیکھ کر سارہ کا منہ بگڑ گیا۔ مگر مسحور چہک اٹھی۔

"آئیے آئیے ہشام صاحب۔ ہماری خوشامد پر بھی آپ نہیں آئے تھے۔ مگر

آپ سے بھی گھر پہ ٹھہرا نہ گیا آخر۔"

ابھی میں لطف اٹھانے نہیں آیا۔" اپنی عادت کے مطابق اس نے خاص گنواروں کے سے لہجے میں لٹھ سا مار دیا۔" میں اتنا اُلّو نہیں ہوں کہ خواہ مخواہ پانی میں بھیگتا پھروں۔ میں تو آپ دونوں کو ایک خاص خوشخبری سنانے آیا ہوں۔ ورنہ مجھے بھلا کیا پڑی تھی۔؟"

"کون سی خوش خبری؟" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔"

باجی کے ہاں کچھ دیر پہلے چاند سی بیٹی ہوئی ہے۔" ہشام نے خوشخبری سنائی مگر بڑی کراہیت سے سنائی۔ پھر بولا۔" پہلے ہی گھر میں چار چار بدشکل بدصورت لڑکیوں کا اچار پڑ رہا ہے۔ اب یہ پانچویں کلوٹی۔ مگر ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ دولھا بھائی بھگتیں گے!۔ بیٹی کی دعائیں مانگتے تھے۔"

اللہ سچ!" سامرہ اچھل پڑی۔"

ہائے۔ باجی کے ہاں بچی ہوئی ہے۔ باجی کی سی گوری گوری ہوگی۔" مسحور بھی خوشی کے مارے بدحال ہو کر بولی۔ پھر جلدی جلدی تھرماس اور گلاس سمیٹ کر ٹوکری میں رکھنے لگی۔ سامرہ نے اپنی کتاب پرس میں ٹھونسی اور بولی۔" چلئے۔ ذرا سڑک کے کنارے سے ایک رکشا کرایہ کا کر لیجئے۔

اپنے باپ کا نوکر سمجھا ہے۔ کیا؟" ہشام بگڑ گیا۔" رکشا کر لیجئے۔ ہنھ۔ جیسے آئی تھیں ویسے جاؤ۔ میں نے تو ازراہ کرم خبر سنا دی ہے میں تو دراصل باجی کے لئے گھٹی لینے جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ایک طرف چل دیا۔ مسحور اور سامرہ نے بڑے برے منہ بنائے۔ سامرہ نے بڑی فراخدلی سے اسے گالیاں دیں۔! پھر وہ رکشے پر گھر آئیں اور جب وہ دالان میں آئیں تو متعدد نظریں ان کی طرف قہر آلود انداز میں اٹھ گئیں دونوں کو ایک شاک سا لگا!"

کیونکہ وہ راستے بھر باجی کی بچی کے اچھے اچھے نام سوچتی رہی تھیں۔ اور یہاں باجی دالان میں سب کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھیں؟"

ایک طرف ابصار صاحب بھی بیٹھے تھے۔ دوسری طرف پھوپھا ابّا براجمان تھے! ایک ساتھ سب ہی ان دونوں کو گھورنے لگے تھے!۔ ابصار صاحب کچھ غصّہ ور مشہور تھے۔ لہٰذا سب سے پہلے انہوں نے جھرجھری دوڑا دینے والے سرد لہجے میں پوچھا۔

"کہاں گئی تھیں۔ کہاں سے آ رہی ہو؟"

جی۔ جی" مسحور نے ہکّا بکّا ہو کر کہا"

جی کیا" ابصار صاحب اب گرجے" تم لوگ اس قدر ترقی پسند ہو گئی ہو کہ من مانی کرنے لگی ہو۔ کس سے پوچھ کر تم نے گھر سے باہر قدم نکالا تھا۔ موسم کی حالت دیکھ رہی ہو۔ یہ موسم سیر سپاٹوں کا ہے؟ تفریح کے لئے تمہارا اپنا باغ کچھ کم ہے کیا۔ یاد رکھو۔ اس مرتبہ معاف کرتا ہوں۔ آئندہ پھر کبھی تم لوگوں کو آوارہ لڑکیوں کی طرح سڑکوں پر گھومتے پھرتے دیکھوں گا تو سخت سے سخت سزا دونگا"

اے بی بی ڈر نہ لگا۔ اکیلی چل کھڑی ہوئیں" چچی اماں نے کہا" ایسا ہی گھومنے کو جی کلبلایا تھا تو کسی کو ساتھ لے لیتیں۔ اشہد تو گھر ہی میں تھا۔ وہ چلا جاتا تمہارے ساتھ۔ مگر یہ تو سوچو کہ شریف گھر کی پردہ دار بچیوں کا اس طرح گھومتا پھرنا کتنی معیوب بات ہے۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا کہ یہ سید گھرانے کی لڑکیاں ہیں۔ توبہ توبہ۔ خیر۔ جو ہوا وہ ہوا۔ پھر کبھی ایسا نہ کرنا!"

مسحور تو سسکیاں لینے لگی۔ مگر سامرہ نے کہا" امی آپ ہی نے پچیس روپے ہمیں بھیجے تھے اور کہلا دیا تھا کہ موسم سہانا ہے۔ چاہو تو گھوم پھر آؤ۔ تبھی تو ہم گئے۔ ورنہ کیا آج تک کبھی ایسا ہوا ہے کہ پوچھے بغیر ہم نے گھر سے قدم بھی باہر نکالا ہو!۔ پوچھ لیجئے مسحور سے۔ کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں"

کیا قصہ ہے بڑی آپا۔!" الہبار صاحب نے اپنی بھاوج سے پوچھا۔
چچی اماں نے ہکّا بکّا ہو کر آنکھیں پھیلائیں "اے بھیّا۔ خدا خدا کرو۔ میں کیوں ایسی حماقت کرنے لگی۔ مجھے تو کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ یہ تو مجھ سے ہشام نے آ کر کہا کہ مسحور اور سامرہ اس کے منع کرتے کرتے گھومنے نکل گئی ہیں۔ سُن کے سر پیٹ لیا میں نے !"

امی۔ ہشام بھائی ہی نے تو آپ کی طرف سے روپے دئیے تھے" سامرہ بولی۔ اب مارے غصّے کے اسکا خون کھول رہا تھا۔ مسحور بھی کچھ کچھ دنگ نظر آ رہی تھی۔ آنسو پونچھ کر بولی "چچا جان۔ ہمیں یہ کہہ کر لائے کہ چلو جلدی سے۔ باجی کے ہاں اچھی ہوئی ہے !"

"اے نوج۔ بدذات۔ ناشدنی" چچی جان بے تحاشا ہنس پڑیں "یہ لڑکا تو سچ مچ جھوٹ بولنے میں ایک نمبر کا شیطان ہے !۔ توبہ توبہ !"

اتنے میں افتخار صاحب بھی آ گئے۔! سارے حالات ان کے گوش گزار کئے گئے۔ انہیں ہنسی کم آئی غصّہ زیادہ آیا۔ بولے "کتنی لغویت ہے۔ بعض وقت چھوٹا موٹا مذاق بھی سنگین صورت اختیار کر لیتا ہے۔ فرض کرو کہ خدانخواستہ اکیلی لڑکیوں پر کوئی اُفتاد پڑ جاتی۔ تب کیا ہوتا۔ آج کل تو پڑھے لکھے مہذب سفید پوش بد معاشوں کی کارگزاریاں عام ہو گئی ہیں۔ کیا اس گدھے کو اتنا بھی ہوش نہیں کہ بہنوں کو شرارت کا نشانہ بنا رہا ہے۔ ایسا چھوٹا نا سمجھ بچہ تو نہیں ہے !"

آنے دو !" الہبار صاحب نے روزمرّہ کی ایک عام گالی جس سے انکی بیوی کے چال چلن پر خاصہ حرف آتا تھا۔ ہشام کو دے کر کہا "کھال نہ اتار دی ہو۔ ناہنجار کی۔ تب کہنا !"

چچی جان نے غیرت کے مارے سر تھام لیا ۔" بیزار ما تھا چھوڑا بدذات سے ۔
پتہ نہیں کیسا چکنا گھڑا ہے ۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی !"
"جان بوجھ کے شیطانی کرتا ہے اور کیا" باجی نے کہا ۔!!!

سامرہ ایسی ہلکی پھلکی ڈانٹیں نوش فرمانے کی عادی تھی مگر مسعود جو بڑے نازوں کی پالی تھی ۔ اسے بڑوں کی ڈانٹ پھٹکار کا تجربہ نہ تھا ۔ اب دوسرے کی غلطی کا بھگتان اس نے بھگت کر جو صلواتیں سنیں تو دم بخود رہ گئی ۔ اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر ذرا سی دیر تو گم صم رہی پھر اچانک سسکیاں لے لے کر رونے لگی !۔ سامرہ اس کے ساتھ ہی آئی تھی ۔ اس کا حال یہ تھا جیسے وہ بیٹھی ہوئی معصوم بیاری سی بلی ہو ۔ گال اس نے بھی پھلا رکھے تھے ۔ ہونٹ لٹکا دئے تھے ۔ اسے صدمہ نہیں تھا ۔ غصہ تھا ۔ وہ چاہتی تھی کہ کہیں ہشام اُسے پڑا مل جائے اور وہ کٹ کھنی بلی کی طرح اس پر پل پڑے اور اپنے تیز پنجوں سے خوب نوچے کھسوٹے !۔ لیکن ہشام شائد اپنی شامت سے بچنے کے لئے باہر ہی رہ گیا تھا !۔ ورنہ وہ اپنی اسکیم کو عملی جامہ ضرور پہناتی !۔ ویسے وہ موقعہ کی منتظر تھی ۔ اور انتقام لینے پر کمر بستہ تھی !"

کچھ دیر تو وہ بھونچی سی بنی مسعود کو سُڑ سُڑ کرتے ناک آنسو پونچھتے دیکھا کی اور پھر اس کی ہیئت کذائی پر بے ساختہ ہنس پڑی ۔ مسعود نے لال بھبھوکا چہرہ اٹھایا اور حیرت سے سامرہ کو دیکھنے لگی !۔ سامرہ نے ہنستے ہوئے اسے تسلی دی "تمہارے لئے یہ نئی بات ہے ۔ تم نے کبھی کاہے کو یہ حرکتیں دیکھی ہوں گی مگر میرے لئے دال روٹی ہے ۔ روز ہم میں نوچا کھسوٹی

ہوتا ہے۔ میں تو سچ مچ ان پر دھاوا بول دیتی ہوں۔ ایک دفعہ ایسے دانت گڑو دیئے تھے کلائی میں کہ خون چھرچھرا آیا تھا اور تین دن تک میرے دانتوں پر ڈیٹول لگاتے پھرے تھے۔"

"مگر ایسا بھی کیا ہے" مسحور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "میں نے ان کے سفید جھوٹ کو بالکل سچ سمجھا تھا۔ خالہ بی کی ذات درمیان میں لائے تھے۔ اب شبہ کیسے ہوتا بھلا۔"

"تم ہی کہو۔ کیسے ناکارہ جھوٹے بدذات آدمی ہیں" سامرہ نے بڑی نفرت سے کہا "تمہیں ان کی بڑی مداح تھیں۔ ان کی اجاڑ سی صورت اور سیرت کی بے حد تعریفیں کیا کرتی تھیں۔ بڑے زندہ دل ہیں۔ بے حد خوش مزاج ہیں۔ یہ اور وہ۔ اب روتی کیوں ہو۔"

"اچھے تو وہ اب بھی لگتے ہیں۔" مسحور نے بے حد سادگی سے جواب دیا اور نارمل ہو کے بیٹھ گئی "میں نے عمر بھر ایسا چرغم آدمی نہیں دیکھا!"

بات کاٹ کر سامرہ بولی "چرغم نہیں۔ ڈھیٹ۔ بے غیرت۔ بے شرم۔"

"ارے اللہ ایسا نہ کہو" مسحور بولی "تم ان سے بے حد خفا معلوم ہوتی ہو۔"

"مجھے تو ان کی صورت سے نفرت آوازے جلن ہے" سامرہ نے کہا "مگر تمہاری پسندیدگی سے یوں لگتا ہے کہ جیسے دال میں کچھ کالا ہے۔"

مسحور کے سفید سفید رخسار ایکدم گلابی ہو گئے۔ جھینپ سی گئی تھی "تم دال کی ہنڈیوں میں کالا سفید کیوں جھانکتی پھرتی ہو۔ ارے۔ دیوانی۔ مجھے اپنی پڑھائی ہی سے فرصت نہیں ملتی جو کسی کو پسند ناپسند کرنے کہاں جا رہی ہوں۔ اب دیکھو ٹرم کی تعطیلات کے بعد ہی سب کس کا پرچہ ہے۔ میں نے ابھی تک کچھ نہیں پڑھا"!

اگر امتحان محبت میں کامیاب ہو جاؤ تو سمجھو کہ سالانہ امتحان میں کامیاب ہو گئیں۔"

لوفروں کی طرح آنکھ مارنے کی کوشش میں ناکام رہ کر سامرہ نے کہا۔

"ہاں ہاں اب معلوم ہو گیا ہے۔ تم نے ضرور ایسا کوئی امتحان پاس کر لیا ہے تبھی تو تمہیں اچھا خاصہ تجربہ ہے" مسحور بولی "سچ بتاؤ۔ وہ آنکھوں کا اندھا کون ہے جس نے ــــــ"

"کوئی مجھے پسند تو کرے۔ دیکھنا اس کے پرزے کیسے اڑاتی ہوں" سامرہ نے فخر سے گردن اکڑا کر کہا۔ "ہمارے تلوں میں تیل نہیں بی بی۔ اور محبت وحبت کو تو میں انسانی جذبوں میں سب سے حقیر، بُرا اور لچر جذبہ سمجھتی ہوں۔ کوئی بات ہے۔ اگر کسی کی ناک اونچی۔ کان سیدھے اور آنکھیں بڑی دیکھیں اور بس چار دن خانے اس پر عاشق ہو گئے۔ اور لگے آہیں بھرنے، سرد سانسوں کی دھونکنی پھونکنے اور کیا نام آنکھوں سے گنگا جمنا بہانے۔ میں تو بھائی اپنے ننھے منے باغیچے سے جتنی محبت کرتی ہوں۔ اتنی شائد گھر کے آدمیوں سے بھی نہیں کرتی!"

"بڑی کٹھور ہو" مسحور نے کہا "تمہیں اپنے امی ڈیڈی اور بھائی بہنوں سے بھی محبت نہیں ہے کیا؟"

"ہے بس گزارے لائق" بے اعتنائی سے سامرہ نے جواب دیا۔

"اور اپنے میاں سے؟" بے ساختہ مسحور نے پوچھ لیا۔ سامرہ کو ہنسی آگئی۔

"ابھی ہے کہاں مُردے نکلا"

"کبھی تو ہوگا!"

"نگوڑا چین سے کھلائے پلائے گا۔ امپورٹیڈ ساڑیاں پہنائے گا۔ اور لڑے جھگڑے گا نہیں تو شائد میں اس کا خیال کرنے لگوں۔ اگر مٹی ملیے نے

کچھ چوں چاں کی تو پھر وہ اپنے راستے میں اپنے راستے!" اتنا کہہ کر سارہ نے آنکھیں نکالیں "

مگر تم اپنی کہو۔ آج عجیب الٹی پلٹی باتیں کر رہی ہو۔ عشق' محبت۔ میاں بیوی۔ بلا بد تر۔ یہ آخر ہے کیا؟"

"اللہ۔ میں تم سی سنگدل نہیں سارہ" سحر نے اپنے دونوں گال اپنے ہاتھوں میں دبا لئے اور بھولپن سے بولی "ایک دفعہ کیا ہوا۔ معلوم؟ کوئی سال بھر پہلے امّی نے کہا کہ اب سحر کا بیاہ کر دینا چاہیئے۔ سُن رہی ہو نہ۔ پاپا نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔ میں صرف اٹھارہ سال ہی کی تو ہوں۔ ابھی کون سی ماری ماری تھی۔ مگر میں خاموش رہ گئی۔ میں نے سُنا کہ وہ کسی ٹھیکیدار کا اکلوتا لڑکا ہے۔ خوب مالدار ہے۔ مگر ایک عیب اس میں ہے کہ نت نئی لڑکیوں سے دوستی کرتا اور کلبوں میں جا کر باپ کی کمائی خوب اُڑاتا ہے۔ مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ یوں لگا جیسے وہ لڑکا میرا سچ مچ کوئی تھا۔ جس کی بے راہ روی پر میرا دل خون ہوا جا رہا ہے۔ پھر میں نے نہایت اعلیٰ درجے کے احمقوں کی طرح سوچا کہ میں اسے راہ راست پر لے آؤں گی۔ توبہ توبہ۔ کتنی اُلو تھی میں بھی۔ پھر وہ قصہ بھول بسر گیا۔ امّی اور پاپا نے ایسا کوئی سوال ہی نہیں اٹھایا لیکن میں منتظر رہی کہ وہ مجھ سے پوچھیں گے تو میں حامی بھر دوں گی ...... دراصل اس لڑکے کی صورت مجھے بے حد اچھی لگی تھی۔ بی مشاطہ امّی کو دکھانے کے لئے تصویر لائی تھیں۔ امّی سے چھپا کر میں نے بھی دیکھ لی تھی۔ اور مجھے بڑا ترس آتا تھا کہ ایسا اچھا آدمی یوں بُری صحبت میں پڑ کر برباد ہوا جا رہا ہے۔ اب تو ...... دیکھو کہ کیا کہتے ہیں۔ وہ۔ تمہارے ہشام بھائی صورت و سیرت کے کتنے اچھے ہیں لیکن مجھے اس قدر افسوس ہوتا ہے ان کی حالت پر کہ بے چارے قطعی اَن پڑھ ہیں۔

اور یہ ایک خرابی ایسی ہے جس نے ساری اچھائیوں کو بھی ان کے عیب بنا کر رکھ دیا ہے۔"

سامرہ اس عرصہ میں کوئی پرچہ الٹتی پلٹتی رہی تھی۔ بیزار سی ہو کر بولی۔"

"بی بی! ایسے موم اور مکھن خیالات رکھو گی تو یاد رکھو کہ ایک روز کسی جھوٹے کے بناوٹی سلوک سے پگھل کر بہہ جاؤ گی۔ کسی سے اتنی متاثر نہ ہوا کرو۔ بیچھیں تمہیں اپنے کام سے کام۔ کوئی بڑے کام کرے۔ کلبوں میں منھ دیتا پھرے۔ لڑکیوں کے پیچھے مارا مارا پھرے۔ باپ کی کمائی نالیوں میں بہائے۔ تمہاری بلا سے۔ ہائے اللہ۔ مسعود! اگر کہیں اس نابکار ناشدنی سے تمہارا بیاہ ہو جاتا تو تم کیسے سر پر ہاتھ رکھ کر روتیں؟"

"اتنی ہی پاگل ہوں میں۔ اور تم سے کیا کہہ رہی ہوں۔"

"پاگل پن کا ثبوت تو یہ بھی ہے کہ تم اللہ رکھے ہشام صاحب کو پسند کرنے لگی ہو۔ مگر ایک بات بتاؤ۔ تم نے ابھی ابھی ان حضرت موصوف کو تمہارے ہشام بھائی کیوں کہا تھا۔ کیا وہ تمہارے بھائی نہیں ہیں۔"

مسعود کے لبوں پر ایک غماز سی مسکراہٹ ابھری۔"میرے تو وہ کوئی نہیں۔ پھر میں خواہ مخواہ انہیں بھائی بند کیوں کہنے لگی۔"

"اچھا جی۔ خناکمتہ۔ یہ باتیں رکھو ادھر۔ یہ کہو کہ چار دن بعد بقرعید ہے۔ تم کیا پہن رہی ہو!"

"میں گوشت نہیں کھاتی۔ مجھے بقرعید یا بکرعید سے کیا سروکار۔" مسعود بولی۔"بھئی میں تو خوب کھاتی ہوں گوشت!" سامرہ نے کہا۔"مگر اچھے کپڑے نہ پہن سکوں گی۔ امی شلوار سوٹ کے ساتھ کا دوپٹہ نہیں لے دے رہی ہیں۔ مجبوراً اس روز مجھے بھی گھٹیا کپڑے ہی لادے رہوں گی!"

رمضانی نے پردے میں سے سر نکال کر جھانکا "کھانا میز پر لگا دیا بی بی۔ اور تاکید کی "ذرا جلدی آیئے گا"

دونوں طعام خانے میں پہونچیں۔ ایک طائرانہ نظر سعود نے حاضرین پہ ڈالی۔ سب موجود تھے مگر ان میں ہشام صاحب کا چاند سا مکھڑا دکھائی نہ دیا۔ وہ سمجھ گئی کہ سزا کے طور پر انہیں فاقہ کروایا جائے گا۔ اس کے خیال کی تصدیق بھی اُسی وقت ہو گئی۔ پھوپھا ابا نے لڑکے سے ہاتھ کھینچ کر کہا "

" بتن بھائی۔ اب معاف بھی کر دیجئے۔ بے چارے نے ایسا کون سا قصور کیا ہے۔ شرارتیں تو اس کی عادت ثانیہ بن کر رہ گئی ہیں۔ مجھ سے کھایا نہیں جا رہا۔ میں اسے آواز دیتا ہوں ! "

سید میاں" انتخار صاحب گرجے " خاموشی سے کھاؤ۔ تم نے اس مردود کی تائید کی تو تم کو بھی میز سے اٹھا دوں گا ! سمجھے۔ ناشدنی کی شرارت ایسی نہیں ہے کہ نظر انداز کر دی جائے ! " میں اسے کل بھی فاقہ کراؤں گا "

پھوپھا ابا نے بڑی بے بس نظروں سے پھوپھی کو دیکھا اور خاموشی سے رکابی پر جھک گئے۔ ان کا انداز اتنا معصوم تھا کہ بے ساختہ پھوپھی کو ہنسی آ گئی۔ کھانا تو پھوپھا ابا کی کمزوری تھا۔ ایک وقت بھی اگر نہ کھاتے تو ان کے بھاری بھرکم بدن سے جان سرکنے لگتی تھی۔ منھ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ لہٰذا پھوپھا ابا نے ہشام کو اس کی سزا بھگتنے کو چھوڑا اور ذرا ہی سی دیر میں اسے بھول بھال کر میز پر لمبے لمبے ہاتھ مارنے لگے ! "

سعود کی حلق میں بھی نوالے اٹکنے لگے۔ کتنا برا لگ رہا ہے۔ اب کیا بیچارہ ساری رات بھوکا ہی رہے گا ؟ اس نے بڑی کینہ توز نظروں سے سائرہ کو دیکھا جو اپنی پسندیدہ چیز اور کٹ بھرے ہندوستانی کباب نگین پر اڑتے کے

نوالوں میں لتھیڑ لتھیڑ کر خوب مزے میں کھا رہی تھی۔ کتنی پیٹو ہے۔ مسحور نے سوچا۔ اور اس خیال سے کہ کوئی اسے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا دیکھ کر سوچ نہ لے۔ جلدی سے اپنی پلیٹ پر جھک گئی!"

پھر ایثار احمد نے چپکے سے کہا: "ڈیڈی۔ میں اسے خوب گھماؤں گا۔ کان پکڑ کر اٹھا بیٹھی بھی کرا دوں گا۔ مگر اب اسے آواز دے لیجئے!"

"تم کھاؤ میاں" ابصار صاحب بور ہو کر بولے۔ حالانکہ ہشام کے باپ تھے مگر ان کے دل میں بھی رتی بھر نرمی نہ تھی!"

میز پر حسب معمول ادھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں!۔ پھر سب کھا پی کے باہر نکلے اور تتر بتر ہو گئے تو مسحور چپکے سے کچن میں آئی۔ رحیمن نانی نے اسے بڑے پیار سے دیکھا اور پوچھا:

"چائے پیو گی بیٹا۔ آج باورچی خانے میں آئی ہو!"

نانی" تھوک نگل کے اور حلق تر کر کے مسحور نے پوچھا: "دو ایک روٹیاں اور تھوڑا سا کباب بچا ہو گا کہ نہیں!"

"اے وہ کیا چنگیری میں روٹیوں کا ڈھیر پڑا ہے" رحیمن نانی نے جواب دیا: "اُدھر لگن میں اتنے بہت سے کباب بھی ہیں۔ افتخار میاں کے گھر کا کارخانہ عجیب ہے۔ جب روٹیاں پکاؤ تو چاول کی پکار پڑتی ہے۔ اور اگر چاول اُبال لو تو روٹیوں کا غل مچتا ہے۔ مگر تم نے۔ سب کے ساتھ پیٹ بھر کھایا نہیں کیا بی بی؟" "میں کھانا تمہارے کمرے میں پہونچا دوں؟"

وافر مقدار میں کھانا دیکھ کر مسحور کے ہاتھ پاؤں خوشی کے مارے پھول گئے۔ نانی کو جواب دیے بغیر اس نے چار پیراٹھے رکابی میں رکھے۔ کبابوں کا بہت سالونده کٹورے میں نکالا اور نیم تاریک صحن عبور کر کے جھٹ اپنے

کمرے میں آگئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ کہیں سامرہ نہ دیکھ لے اور پھر نتھنوں میں تیر ڈالے۔ اسمانے سب کچھ سنگھار میز کے بڑے خانے میں چھپا دیا پھر کسی غیر متوقع وقت کا انتظار کرنے لگی۔ ہشام کے کمرے میں کھانا پہونچانا۔ اسے کھلانا۔ کتنا بڑا جان جوکھم کا کام تھا۔ وہ حیران نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے گا۔ کچھ الٹی سیدھی بات سوچنے لگے گا۔ اگر وہ کچھ پوچھ بیٹھا تو پھر۔ یا خدا۔ آخر وہی اس کی ہمدردی میں کیوں اندر لوٹی ہوئی جا رہی ہے۔ جبکہ اس کے ماں باپ ہی اسے مڑ کر نہیں پوچھ رہے !؟

آہستہ آہستہ وقت گزرتا رہا !؟ اور وہ چپ چاپ اندر اندر بے چین ہوا کی۔ اگر یونہی رات گزرتی گئی تو کیا وہ اس کا بند دروازہ کھٹکھٹا کے اندر جائے گی اور اسے کھانا دے سکے گی۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ کام تو وہ ساری عمر نہ کر سکے گی۔ چاہے وہ زندگی بھر بھوکا رہے !؟

جھنجھلا کر وہ صوفہ پر آ بیٹھی۔ اور خود پر خفا ہونے لگی۔ کس خبط نے اسے گھیرا آخر اس کا خیال کیوں کر رہی ہے۔ وہ چند روز کے لئے یہاں آئی ہے۔ امی پاپا واپس آئیں گے وہ چلی جائے گی۔ اسے کسی سے کیا لینا دینا ہے۔ لیکن دماغ کی ان تاویلوں کو دل نے نہیں سنا !۔ اور وہ ایک بار پھر سوچنے اور کڑھنے لگی !؟

لیکن غالباً اس کی خوش قسمتی تھی کہ جب وہ اندھیرے کمرے میں بیٹھی پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ باہر کچھ غیر معمولی شور و غل کی آوازیں گونجیں۔ مسعود کا دل دھڑکا۔ اور وہ اٹھ کر دروازے تک آئی۔ دالان میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ اور خواتین پریشان سی اِدھر اُدھر پھر رہی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ پھوپھی اور چچی جان بڑی احتیاط سے سنبھال سنبھال کر باجی کو ان کے کمرے میں لا رہی

تھیں۔ آن واحد میں مسحور نے معاملہ سمجھ لیا۔ خوشی کا ایک فوارہ سا اس کے دل میں اُبلا۔ تو یہ بات ہے۔ اب اس کی راہ آسان تھی!!

گھر کے مرد تھوڑی سی چپقلش کے بعد پھر اپنی خواب گاہوں میں بند ہو گئے۔ باجی کے ساتھ ان کے شوہر ارشاد احمد اور بھائی جان گئے تھے۔ عورتیں ساتھ تھیں۔ سارہ بھی نیند سے جاگی تھی۔ یہ سن کر کہ باجی میٹرنٹی ہوم لے جائی گئی ہیں۔ وہ بُرا سا منہ بنا کر پھر سے سو گئی۔ اس کے نزدیک یہ بڑا غیر شاعرانہ اور غیر دلچسپ کام تھا! جس کے ہاں بچہ ہوتا ہے۔ وہی ماں بنتی اور فخر کرتی ہے۔ دوسروں کو بیکار میں کھیسیں نکالنا کیا ضروری ہے!!

مسحور بھی دالان کی دہلیز تک آئی تھی۔ اسے معلوم ہوا کہ ہشام ہی بھاگ کر ٹیکسی لایا تھا اور دیر تک اپنے کمرے کے سامنے کھڑا رہا تھا۔ اور وہ فی الحال جاگ ہی رہا تھا!۔ اس کے کمرے میں روشنی تھی۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ مڑ کر کمرے میں گھسی اور جھپٹ کر سنگار میز کے خانے سے رکابی کٹورا نکالا۔ پھر کپکپاتے قدموں سے ہشام کے کمرے تک آئی!۔ لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کمرے کے اندر بھی جا سکتی!!

رکابی کٹورا تھامے وہ کھڑی آنکھیں پھیلاتی اور کمرے میں چھائی ہوئی روشنی کو گھورا کی۔ اب اپنی حماقت پر وہ ہزار ہزار بار پچھتا رہی تھی۔"

اور پردے کے نیچے ایستادہ نسائی قدموں کو کمرے سے ہشام گھور رہا تھا۔ اسے تعجب تھا۔ بھلا بارہ بجے رات کو سارہ نے اس کے کمرے تک آنے کی زحمت کیوں کی ہے؟۔ کیا اسے کوئی شرارت سوجھی ہے۔"

جب اس سے ضبط نہ ہوا تو وہ اٹھا اور لپک کر پردہ سرکا دیا۔ آن کی آن میں دونوں کی نظریں ملیں۔ حیرت کے مارے ہشام بُت بن گیا۔

اور مسحور سچ مچ گڑ گئی!"

"آپ" ہشام حیرت کے مارے ہکلایا "آپ۔ کیا کھنے آئی ہیں"

ان میں تکلف اور حجاب کی دیوار ابھی تک کھڑی تھی۔ اور بات چیت آپ جناب سے باہر نہیں بڑھی تھی۔ ہشام کو تو خوب خبر تھی کہ اگر اس نے مسحور سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تو پھر اس کا انجام بخیر و خوبی نہ ہو گا۔

بصد وقت مسحور نے حلق سے آواز گھسیٹی "آپ کا کھانا۔ لائی ہوں۔ کھا لیجئے آپ کو۔ بھوک لگی ہو گی۔ اب۔ سوا بارہ بجنے والے ہیں"

میرے بارہ تو تبھی بج گئے تھے۔ جب پیٹ میں شیر ببر گرج رہے تھے" وہ اب بھی بڑے وحشی انداز میں ہنس کر بولا "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مگر کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں سچ مچ بھوکا ہوں!"

برتن مسحور کے ہاتھوں سے پھسلنے لگے۔ وہ اسے تکنے لگی تھی۔

"ارے مجھ سا کنگلا بیٹھو بھلا اس وقت تک کھائے پیئے بغیر رہ بھی سکتا ہے۔ اس نے کہا "آپ بھی ہیں نا۔ آٹھ ہی بجے سب سے پہلے پھوپھی اماں مجھے پیٹ بھر کھانا کھلا چکی ہیں۔ مطلب یہ کہ آپ سب سے پہلے میں نے کھایا ہے" وہ جاہلوں کی طرح گھوں گھوں کر کے ہنسا۔ مسحور کو اپنی اس حاسرنا بھری پوزیشن پر بڑا غصہ آیا۔

"تو پھر۔ میں۔ جو یہ سب کچھ لائی ہوں" وہ بگڑ گئی۔

"یقین مانئے کہ آج تو خوب ٹھونس لیا ہے۔ ورنہ آپ کی خاطر یہ بھی کھا لیتا۔ سچ مچ اب بالکل گنجائش نہیں۔ یہ آپ نوش فرمائیے۔ اچھا شب بخیر" اور الٹے قدموں کمرے میں گھس کر کھٹاک سے دروازہ بند کر لیا۔ روشنی گل کر دی۔ مسحور کے طیش کا کیا پوچھنا۔ اس نے برتن وہیں چوکھٹ کے پاس رکھ دیئے اور

پھنکارتی ہوئی واپس آئی۔ غصّے کے مارے تن بدن آگ ہوا جا رہا تھا۔ اسے ہشام پر کم اور خود پہ غصّہ زیادہ تھا۔ بھلا اُسے اتنی محبت جتانے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اب وہ کیا سوچے گا۔ صبح کو وہ اس سے کیسے نظریں ملائے گی۔ کیا پتہ۔ اب وہ سارہ کی طرح اسے بھی چٹکیوں میں اُڑائے۔

اس نے خواہ مخواہ اپنی نیند کھوئی۔ سکون غارت کیا۔

پھوپھی اماں بھی خوب ہیں۔ اسے بھلا آئی تھیں۔ تبھی تو کھانے کی میز پر چُپ چاپ مزے مزے میں کھا رہی تھیں!"

صبح تک الجھنوں کے مارے وہ سوچتی جاگتی رہی۔ پتہ نہیں کون سا وقت تھا۔ جب کسی نے اس کے کان کے پاس گنگنا کر کہا "

" لڑکا! "

اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اور ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ کمرے میں بڑی خواب آگیں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور سارہ صوفہ کے پاس کھڑی نماز کا دوپٹہ سر سے لپیٹ رہی تھی!۔ دُور موذن بڑی رُوح پرور آواز میں قرات کر رہا تھا:

الصّلوٰۃ خیرٌ من النّوم "

کمرہ بند کر کے نہیں سوتیں!" سارہ بولی " زمانہ اچھا نہیں ہے۔ اندر سے کنڈی دے کے سویا کرو!"

تم نے ابھی کچھ کہا تھا میرے کان میں " مسحور نے پوچھا "

" ہاں۔ تھوڑی دیر پہلے میٹرنٹی ہوم سے فون آیا تھا۔ باجی کے ہاں پھر لڑکا ہوا ہے۔ ڈیڈی نے کہلوایا ہے کہ جلدی سے نماز پڑھ لیں تو پھر ناشتہ کر کے چلیں گے بچّے کو دیکھنے کے لئے!" سارہ بہت خوش تھی " اٹھو جلدی کرو۔

اتنی افیوچی کیوں ہو گئی ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کار بھجوادی ہے۔ دیر کرو گی تو ڈیڈی اکیلے چلے جائیں گے!"

بعد نمازدہ دالان میں آئیں۔ تب بوا رحیمن ناشتہ لگا رہی تھیں۔ تخت پر ہشام صاحب بھی موجود تھے!۔ رات کی سنگین سزا" کارتی بھر اثر ان پر نہ تھا۔ نہ یہ خیال تھا کہ سزا بھگتنے کے بعد افتخار صاحب کو صورت نہ دکھائیں۔

ابصار صاحب بھی تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے آ گئے!"

گڈ مارننگ ڈیڈی! "ہشام نے انہیں سیلوٹ کیا"

"لاحول ولا قوۃ۔ ہزار بار کہا تم انگریز کی اولاد نہیں ہو۔ اسلام علیکم کہا کرو۔ ابصار صاحب نے کہا:

اسلام علیکم ڈیڈی!" اس نے قرأت سے کہا:

"وعلیکم!" ابصار صاحب کھنکھارے۔ اور ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئے:

مسعود بہت محجوب ہو رہی تھی۔ کیا معلوم یہ کچھ بکواس نہ کر دے"

مگر وہ اس کی طرف متوجہ تک نہ ہوا۔ بڑی شائستگی سے رات کا باسی پراٹھا چائے میں ڈبو ڈبو کر کھاتا رہا۔ اور کچھ کچھ کراہتا رہا۔ بالآخر جھلا کر ابصار صاحب نے پوچھا: کیا ہو رہا ہے۔ کیوں کانکھ رہے ہو!:

"کل کل اسی وقت، چائے پی تھی" وہ بڑی فاقہ زدہ آواز میں بولا" سارا دن ساری رات پیٹ میں مروڑیاں اٹھتی رہیں۔ اب یہ چائے معدہ میں پہنچ کر ہڑتال کر رہی ہے ڈیڈی۔!"

ساجرہ کو ہنسی آ گئی!" مسعود اس کے جھوٹ پہ منہ بنا کر رہ گئی"

تو بہ کی اپنی خباثتوں سے کہ نہیں؟: ابصار صاحب نے پوچھا:

آپ لوگ مجھی کو جھوٹا سمجھتے ہیں ڈیڈی!" اس نے منہ پھلا لیا"

"ارے بھائی یہ صبح صبح چائے کی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے" برآمدے سے جھانک کر پھوپھا ابّا نے پوچھا۔

"آؤ آؤ!" ابصار صاحب ہنس کر بولے "آج ذرا جلدی ناشتہ ہو گیا۔ ہم جا رہے ہیں ماہرہ کے بچے کو دیکھنے۔ اگر چاہو تو تم بھی چلو!"

"ماہرہ کا بچہ۔ اماں واللہ" ابصار بھائی!" پھوپھا ابّا بھونچکا ہو کر بولے "یہ ماہرہ کی شادی کب ہوئی؟"

"ارے پھوپھا ابّا سب چلتا ہے۔ ہشام بول پڑا۔ افتخار صاحب کو اچھو لگ گیا"

"اٹھو۔ یہاں سے بھاگو۔ گدھے" ابصار صاحب کو ہنسی آ گئی۔ پھوپھا ابّا منہ دھوئے بغیر آ کے بیٹھ گئے۔ لڑکیاں ہنسی روکتی اٹھ کر چلی گئیں۔ ان کے پیچھے ہشام بھی صحن میں نکل آیا۔

"کپڑے تو بدل لو۔" اس نے سارہ سے کہا "نجانے کس بدذوق نے پھول دار شلوار سوٹ نکالا ہے۔ بالکل بھنگن معلوم ہو رہی ہو۔ ہسپتال والے ہاتھ میں بالٹی اور جھاڑو پکڑا دیں گے"

"آپ خود ہزار بار بھنگی!" سارہ بھی بھنائی۔

"اچھے خاصے کپڑے تو ہیں" سیجو نے کہا۔

"آپ کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ آپ اس لباس میں بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ لیکن یہ۔ جیسے کسی نے تربوز پر دو عدد کاجو چپکا دیے ہوں۔ شکل و صورت پر نمک کا چھینٹا تک نہیں!" ہشام نے کہا۔

"سچ مچ ہاتھ مار دوں گی ہشام بھائی!" سارہ اس کی طرف دوڑی مگر پھر رک گئی۔

"اپنے میاں پر مار نا ہاتھ۔ میں فاقے کر کر کے یونہی دُبلا ہوا جا رہا ہوں۔ کوئی دو دو نوالوں کو پوچھنے والا بھی نہیں۔ ناقدری کی انتہا ہے!"

"اپنی کرنی تو دنیا میں کوئی دیکھتا ہی نہیں" جل کر سارہ نے کہا "دوسروں کی آنکھ کا تنکا بڑی جلدی نظر آجاتا ہے"

"جیسے جیسے تم بڑی ہو رہی ہو۔ زیادہ ٹرّی اور زبان دراز ہو رہی ہو۔ معلوم نہیں سسرال میں تمہارا کیا حشر ہوگا"

"میری فکر میں آپ مت دُبلے ہوئیے!" سارہ چلائی

"چپ چپ۔ وہ لوگ آ رہے ہیں" مسحور جلدی سے بولی

میٹرنٹی ہوم پہونچ کر ہشام تو جیسے پاگل ہی ہو گیا۔ یوں لگتا تھا اس نے پہلی بار کوئی ننھا بچّہ دیکھا ہو۔ اور تو سب وارڈ میں ادھر ادھر بیٹھے ماں بچّے کی خیریت پوچھنے لگے تھے۔ ہشام جھولے پر جھکا اور ایک دن کے گلگلے ایسے بچّے کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگا!"

"اب اس کی ہڈی پسلی سرکاؤ گے کیا۔؟" اس کی امی چیخیں "چین سے آ کے بیٹھو ادھر۔ گھر چل کے آرام سے گود میں لینا"

وہ احمقانہ انداز میں عبرت انگیز طریقے پر بزرگوں کو دیکھتا ہوا بولا "کیا خدا کی شان ہے۔ ایک دن کبھی بچا میاں ڈیڈی اور آپ لوگ بھی اتنے ہی بالشت بھر کے جھولے میں پڑے چیں چیں کرتے ہوں گے۔ اور آج اتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ مجھے تو پتہ ہی نہ چلا آپ لوگوں کے قد کیسے بڑھ گئے!"

اس کی بکواس کو نظر انداز کر کے افتخار صاحب نے دریافت کیا "لیڈی ڈاکٹر نے گھر لے جانے کی اجازت دی ہے کہ ابھی نہیں!"

"ائے ہاں۔ اللہ نے بڑی مشکل آسان کر دی۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔

آج شام تک گھر آجائیں گے!" بیوی نے جواب دیا۔"

اس لیئے کہہ رہا تھا کہ بھئی پرسوں بقرعید ہے۔" افتخار صاحب نے کہا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ یہ اچھا نہیں لگے گا کہ ماہرہ اور ماشاء اللہ بچے گھر سے دور ہوں۔"

چاروں بچیاں اب ننھے منے گول مٹول سے بچے کو جھولے سے نکال لائی تھیں۔ وہ چھوٹی چوکی پر پڑا ذرا ذرا سی پلکیں جھپکا رہا تھا۔ اور سب بے حد محبت و مسرت سے اسے دیکھ دیکھ کر تبصرے کر رہی تھیں۔"

"باجی آپ نے اچھی طرح دیکھا! کہیں یہ خدانخواستہ عورت بچی تو نہیں ہے۔" ہشام کی سہمی سی آواز گونجی۔"

تمہاری پیشین گوئی غلط نکلی۔" ماہرہ ہنس دیں۔"

کمرے میں عجیب سی چیاؤں میاؤں مچی تھی۔ افتخار صاحب اور اظہار صاحب گھبرا کر باہر نکل آئے۔ کچھ دیر بعد دوسرے لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے سارہ منمنائی۔" ممی۔ پھر آپ نے کہا نہیں۔ میرا میچنگ دوپٹہ۔ مجھے بس سو روپئے دے دیجئے۔ میں خود دوپٹہ چپلیں اور چوڑیاں لے لوں گی۔ اب کالج بھی تو کھل رہا ہے نا ممی!"

افتخار صاحب کی بیگم غرائیں۔" بیکار پھینکنے کے لئے فالتو پیسے میرے پاس نہیں ہیں۔ سمجھیں۔ یونہی کپڑوں سے الماری بھری ہے۔ پہلے وہ پہن کے ختم کرو۔ اب کالج کھلے گا۔ سہ ماہی فیس دینی پڑے گی۔ پھر عید کے اخراجات ہیں۔ اللہ رکھے اس کے بعد زچہ بچہ کا چھٹی چلّہ۔ نہیں نہیں۔ پیسے دیسے نہیں ملیں گے۔ لاکھ تم منہ بسورو۔ آخر سحر، شینا اور صدف بھی تو ہیں۔ کسی کو کپڑوں کا موڑ کا نہیں۔ مرد بچیلے تک نے رومال یا موزوں کے لئے کانی کوڑی نہیں

مانگی۔ تمہارے ہی لئے کون سی عید نئی آرہی ہے "

اصل میں مرد بچے بڑے شریف اور عقل مند ہوتے ہیں نانی اماں " ہشام نے انہیں سمجھایا " آپ عقل کی کوری چھوکریوں سے ہم مرد بچوں کا مقابلہ کر کے ناحق ہماری توہین فرماتی ہیں "

سامرہ نے یوں اسے گھورا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں نگل لے گی "

ماہرہ کے گھر آنے کے بعد چہل پہل بڑھ گئی۔ ان کی سسرال سے کوئی نہ کوئی روز آتا۔ ان کی خاطر مدارات ' بچوں کا شور' عید کا قرب۔ عجیب سی افراتفری مچی رہتی۔ عید کے بعد ہی سب کے کالج اور مدرسے بھی کھلنے والے تھے۔ بڑی مصروفیت تھی "

سامرہ تو بھری ہوئی تھی۔ مسعودہ سے بولی " دیکھ لینا۔ انہی میلے کچیلے کپڑوں میں اگر عید کے دن بھی نہ گھوموں۔ بھائی جان کے مانگتے ہی امی کی الماری کا منہ کھل جاتا ہے۔ ہمیں سو روپے بھی نہیں ملتے ! "

" ناشکری مت کرو " مسعودہ بولی " تمہیں تو خالہ بی ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ دیتی رہتی ہیں اور بھئی بھائی جان کا تو یہ ہے کہ وہ ہزاروں کماتے بھی تو ہیں ! " "

" اور تمہارے امی کا خط آیا تھا۔ کیا لکھا ہے۔ میں پوچھنا بھول گئی تھی ؟ "

آنے جانے کا حال نہیں لکھا " مسعودہ بولی " صرف خیریت لکھی ہے۔ مجھے دھیان سے پڑھنے کی تاکید کی ہے۔ اور بس۔ مگر سامرہ۔ سچ پوچھو تو اب پڑھنے میں میرا دل ہی نہیں لگتا ہے۔ جانے کیا جی چاہتا رہتا ہے۔ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی "

" تم شعر و سخن کی دیوانی۔ افسانے کی سرزمین میں رہنے والی پاگل سی روح ہو۔ جو کچھ تمہارا جی چاہتا ہے وہ تم کر نہیں سکتیں۔ کہہ نہیں سکتیں۔ کیا فائدہ

بیکار خون جلانے سے بی بی ۔ دنیا میں جینا ہے تو بالکل خشک انسانوں کی طرح جیو۔ اچھا کیا کہیں نگوڑ ماری محبت کا روگ لگا لیا ہے !" سارہ بے حد الکل کھڑی تھی۔ اسے تیری میری محبت کی ہوا چھو کے بھی نہیں گزری تھی !۔ مسعود مسکرائی۔

"تم خالہ بی اور پھوپھی اماں کی طرح نگوڑی بولتی ہو تو مجھے اچھا لگتا ہے۔"
سارہ کو اس کی بات کا جواب نہیں ملا تھا۔ اس نے پرواہ بھی نہ کی۔ اپنی جی سے بدلہ لینے کی تدبیریں سوچا کی"

باہر سب سے ملنے کے لئے جانے کہاں کہاں کی رشتہ دار خواتین آئی تھیں۔

ایک شور بے ہنگام برپا تھا !"
مسعود اٹھ کر بڑی سی خوب صورت کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ موسم اب بھی بے حد حسین تھا۔ دن بھر پانی برسا کیا تھا۔ دیواروں پر عشق پیچاں کی بیلوں کو سرساتا، پرنالوں اور کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکراتا۔ اس قدر تسلسل سے مینھ برسا کہ باغ کی ننھی منی نہریں لبریز ہو گئیں پانی شفاف روشوں پر بہہ نکلا اس طوفان باد و باراں میں جب ہوا ہر چیز کو اڑائے لئے جاتی تھی۔ اور پانی جلترنگ بجا رہا تھا۔ ساری مخلوق حتیٰ کہ پرند و چرند بھی محفوظ جگہوں پر چھپے بیٹھے تھے ۔ مسعود کا دل نجانے کیا چاہنے لگا۔ وہ اپنے محسوسات پر عقلمندی کے پہرے نہ بٹھا سکی !!

اب یہ وہ ہی کون سادہ گیا تھا۔ اگر وہ اسی برآمدے سے نکل چلے تب۔ اس کا کمرہ اسی قطار میں تو ہے"

آہ ۔ وہ جاہلانہ معصومیت ۔ بے خبری کی باتیں ۔ دنیا کے مکر و فریب سے قطعی آزاد ۔ مجھے وہ کتنا پیارا سا لگتا ہے ۔ اس نے مڑ کر سارہ کو دیکھا ۔ وہ خشک اور روماں بیزار لڑکی بڑے انہماک سے اپنی کتابیں جھاڑ پونچھ کر

ایک میں لگا رہی تھی اور ایک مرتبہ پھر کالج کی گہما گہمی میں کھو جانے کا خیال اس کے لبوں پر مسکراہٹ بن کر چھلک رہا تھا!"

ہُنھ! ۔ دنیا میں تعلیم ہی تو سب سے ضروری نہیں۔ خاص کر لڑکیوں کی تعلیم ایک ملغوبہ سا مسحور کے حلق میں اٹک گیا۔ جانے کس کس اسکول اور کالج میں لاکھوں لڑکیاں دن رات پڑھنے میں جتی ہوں گی۔ ایک دن ان گنت لڑکیاں بڑی بڑی سندیں لے کے نکلیں گی۔ آخر ان سب کا ہو گا کیا؟ وہ سب کی سب کہیں کی منسٹر، گورنر، بیرسٹر بن جائیں گی؟۔ ان لوگوں کا مقدر گھر گرہستی ہی ہے ڈگری گلے میں لٹکائے چولہا پھونکیں گی؟۔ عورت کا کام یہی ہے۔ تو پھر۔ وہ کیوں خواہ مخواہ جھک مار رہی ہے۔ یک بیک اس کا جی اُچاٹ ہو گیا۔

اسے یاد آیا کہ اس کے ماں باپ باوجود اس کے کہ وہ ان کی اکلوتی ناز و نعم میں پروردہ لڑکی تھی۔ جلد سے جلد اس کی شادی کے لئے کوشاں تھے۔ اپنے رشتے داروں سے ملاقات کا ایک بہانہ یہ بھی تھا وہ مسحور کے لئے اچھے لڑکے کی تلاش بھی۔ کیا ہو گا اگر کوئی منحوس مارا اچھا لڑکا ہاتھ آ ہی گیا۔ وہ بھی اپنی پہلی اور آخری خاموش محبت دل کے تہہ خانے میں چھپائے آہیں بھرتی ڈولی میں جا بیٹھے گی۔ بھلا کون جانے گا وہ کیا چاہتی رہی تھی۔ اور پھر۔ اس کی یہ آرزو قابل پذیرائی ہے بھی تو نہیں۔ ناممکن سی بات۔ وہ ہستی جسے اس نے خیالوں میں بسا رکھا ہے۔ قطعی طور پہ کسی کے لئے اہم نہیں۔ ان پڑھ، جاہل، گنوار، جانور، کئی سہانے خطاب ہیں اس کے۔ کوئی اسے گھر بھر پلے جانور سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ بس کھانا پینا اور مست قلندر بنا ڈنڈے بجاتا پھرتا ہے۔ ماں باپ تک اسے یوں نہیں چاہتے جیسے اسے چاہا جانا چاہئے۔ چھوٹے بہن بھائی چٹکیوں میں اُڑاتے ہیں۔ اس کی شادی ایک ایران کس بات

ہے۔ بھلا کس باپ پر اس کی بیٹی بھار رہی ہے کہ وہ بے روزگار جاہل کے حوالے کر دے؟
اور وہ تو خاصے دولت مند ماں باپ کی بیٹی ہے۔ وہ لوگ اس کے لئے اپنی ٹکر کا خاندان ڈھونڈیں گے۔"

وہ سارہ کی آواز سے چونکی۔ چونکی کیا اپنے تخیلات کی جنت سے واپس حقیقت کے دوزخ میں آئی!۔

"مارے ہیں گرد میں اَٹ گئی ہوں" وہ کہہ رہی تھی "ذرا نہا ڈالوں۔ تمہارا جی چاہے تو میرے مضمون پر ایک نظر ڈال لینا۔ کوئی غلطی ہو تو بعد میں ڈسکس کر لیں گے!۔ تم نے تیار کر لیا مضمون؟"

"مجھے تو یاد بھی نہیں رہا!" ایک پھیکی بے رس مسکراہٹ مسحور کے لبوں پر رینگی "جانے کون سی دھن میں رہنے لگی ہو۔ لکھ لو۔ ابھی دو دن باقی ہیں۔ میں تو بھائی مسز درانی سے بہت ڈرتی ہوں۔ ساری کلاس کے سامنے دھجیاں اڑا کے رکھ دیتی ہیں!۔ خواہ مخواہ ان کی باتیں کیوں سنو!"

"میں بہت بدل گئی ہوں۔ سارہ" مسحور نے کہا "میرے خیالات میں بہت سے انقلاب آ گئے ہیں۔ تم جس طرح سوچتی ہو۔ میں نہیں سوچتی!"

"تم پاگل ہو رہی ہو" سارہ نے حسب عادت اُسے ٹکا سا پکڑا دیا۔ اور بانہوں پر کپڑے ڈال کر غسل خانے میں گھس گئی!!

برآمدے کے نیچے شور میں ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ سب بچے وہاں جمع تھے ہنسی قہقہے، آوازیں۔ کیا ہو رہا ہے وہاں۔ مسحور نے جھک کر جھانکا۔ بارش رک چکی تھی۔ ایک جگہ گڑھے میں بہت سا پانی جمع ہو گیا تھا۔

ہشام اندر سے بہت سے اخبار اٹھا لایا تھا اور نہایت اہتمام سے کاغذ کی بڑی بڑی ناؤ بنا کر بچوں کو دے رہا تھا۔ اپنی اپنی ناؤ بچے پانی میں تیرا رہے تھے۔ ان میں مقابلہ ہو رہا تھا۔ کس کی ناؤ جلدی سے "ساحل" تک پہونچتی ہے۔ اچانک ایک مینڈک کا ننھا سا بچہ پانی میں اچھلا۔ اور ساتھ ہی ایک شور ابھرا:

"مگرمچھ۔ مگرمچھ"

ہشام نے ہاتھ بڑھایا اور ننھے بچے کو ہاتھ کے کٹورے میں لے لیا۔ اب وہ کوشش کر رہا تھا کہ ایک بڑی سی ناؤ میں بچے کو بٹھا دے!۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا۔ دوہرے کاغذ کی مضبوط سی ناؤ مینڈک کے بچے کو لے کے چلی۔ اور بے شمار تالیاں بج اٹھیں۔

"شای کھیا۔ ایک بچہ ہمیں پکڑ دیجئے!" صدف للچائی۔ "کہاں سے پکڑ دوں۔ ہو بھی تو" وہ جھلّایا "مینڈکی ایک ہی دے کے چلی گئی۔ کہو تو میں بن جاؤں مینڈک کا بچہ؟"

ننھی سی تلیاّ پر ایک سایہ سا منڈلایا۔ سب نے نظریں اٹھائیں۔ اور مسحور کو دیکھ کر زیادہ جوش و خروش سے اسے اپنا تماشہ دکھانے لگے۔

"ارے آپ!" ہشام نے خوش ہو کر کہا اور بڑے دھڑلے سے بولا "جب سے آپ نے مجھے کھانا لا کے کھلایا ہے۔ میں آپ کو بے حد اچھا سمجھنے لگا ہوں۔ اس نکچڑھی سے تو آپ لاکھ درجہ اچھی ہیں۔ آئیے آئیے۔ بیٹھئے" اس نے شینا کو للکارا "کاغذ دوہرا کر دو۔ انہیں ایک بڑی سی کشتی بنا کے دوں۔ مگر ٹھہرو۔ پہلے ذرا مینڈک کا بچہ تو ڈھونڈ لیں" اس نے کسی قسم کی کراہیت کے بغیر شڑاپ سے پانی میں ہاتھ ڈال دیا۔ مسحور بوکھلا گئی۔ کوئی اس

کی بکواس سُن لے گا تو کیا کہے گا۔

بدقت وہ بولی: "نہیں نہیں۔ مجھے کشتی نہیں چلانا۔ میں تو ان کے کھیل دیکھ کر آگئی ہوں"

"اچھا اچھا۔ مگر بیٹھئے تو سہی۔ میں کشتی بنا کے ضرور آپ کو دوں گا۔ اگر مینڈک کا بچہ نہ ملا تو۔ کشتی میں باجی کے بچے کو بٹھال دیں گے" اس نے احمقانہ قہقہہ لگا کر بچوں کی طرف دیکھا اور ایک آنکھ دبائی۔

ارے شامی بھیا۔ یہ کیا؟" اشہر چیخا۔

کہاں!"

یہ ادھر کنارے پر"

ہشام نے پانی پر ہاتھ مارا۔ فوارہ سا اڑا اور سب کے چہروں پر کیچڑ سی پُت گئی۔ جب اس نے ہاتھ اوپر اٹھایا تو سحر نے دیکھا کہ اس نے چٹکی میں ایک پتہ پکڑ رکھا تھا۔ جس کی نوک سے ایک ننھا سا گھناؤنا کیچوا لٹک رہا تھا"

چھی چھی۔ تھو۔ لانت ہے" ہشام نے ابکائی لی اور ہاتھ جو جھٹکا تو کیچوا سحر کے شرٹ کے دامن پر آپڑا۔ اس کے منھ سے ایک چیخ نکلی۔ اور دامن جھٹک کر وہ بے اختیار بھاگ پڑی۔ بچے بے تحاشہ ہنس رہے تھے۔ اور اس وقت اُسے جو طیش آیا تو اس نے دانت پیس کر سوچا کہ بالکل گدھا ہے۔ بدتمیز۔ وہ بڑی لاپروائی سے آگے بڑھ گئی"

وحشی کہیں کا۔ کہہ رہا تھا کہ آپ نے کھانا کھلایا۔ اس نے کھایا کہاں تھا۔ دوسری صبح کو چوکھٹ کے پاس برتنوں میں کھانا رکھا دیکھ کر جھوٹو نانی نے جو چنگھاڑیں لگائی تھیں وہ سحر کے کانوں میں اب بھی گونج رہی تھیں۔

ہشام کھیل سے اکتا کر باجی کے کمرے میں گھس گیا!"

ایثار احمد لانگ چیئر پر لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے۔ باجی ننھے کو گود میں لئے ان کی طرف سے بیٹھ پھیرے بیٹھی تھیں۔ وہ باجی کے پاس گھس کر بیٹھ گیا۔ ایثار احمد نے اخبار الگ رکھا۔ ایک ہلکی سی انگڑائی لی اور مسکرا کر ہشام کو دیکھنے لگے"

"کہو بھئی۔ کیا حال احوال ہیں۔ آج کل کیا کر رہے ہو؟"

جی کچھ نہیں" اس نے بڑی شان سے جواب دیا" فی الحال وضو بنا کے مجد جاؤں گا۔ آج کل باقاعدہ نمازیں پڑھ رہا ہوں۔ ارے دولھا بھائی میری دنیا نہ بنے نہ سہی۔ دین تو بن جائے گا!۔ اللہ اللہ کرتے رہی سہی بھی گزر جائے گی"

ایثار نے قہقہہ لگایا" مولانا صاحب۔ آپ نے ابھی کیا فرمایا تھا۔ وضو کر کے آپ کہاں جائیں گے؟"

مجد!" اس نے سادگی سے کہا"

"واقعی ہشام تم" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ پھر بولے" میاں۔ یوں کہو کر وضو کر کے مسجد جاؤ گے!" بھلے آدمی۔ روزمرہ کی اچھی بول چال تو کم سے کم سیکھ جاؤ!"

دولھا بھائی اس بگی عمر میں کیا سیکھ جاؤں" اس نے ٹھنڈی آہ لی" بڑھے طوطے لوگ چلے تماشے۔ بچے مجھ پر تالیاں نہیں بجائیں گے۔ آپ لوگوں نے شروع سے دھیان دیا ہوتا تو آج میں بھی آپ کی طرح میٹرک تو ہو ہی جاتا!"

ابے بد معاش۔ کیا میں میٹرک ہوں؟" ایثار نے آنکھیں نکالیں"

مم ۔ مڈل !" وہ گھبرا گیا"۔

بچو۔ تم کو یہ بھی پتہ نہیں کہ اونچی جماعتیں کتنی ہوتی ہیں ؟"

" معلوم ہیں ۔ دس سے اوپر تک جتنی ہوں گی سب اونچی ہی ہوں گی !"

اچانک اس کی نظر ایثار احمد کی جیب پر پڑی ۔ باریک ململ کے کرتے کی جیب میں رکھا سگریٹ لائٹر اور اس کے پاس سَو کا نوٹ صاف دکھائی دے رہا تھا ۔ ہشام کی تقدیر یاور تھی کہ نوٹ کا ذرا سا کنارہ لائٹر رکھنے کی گڑبڑ میں جیب کے منہ تک آگیا تھا ۔ وہ بولا " دو لھا بھائی ۔ آپ نے یہ والا فلم دیکھا ۔ نام پڑھ کے بتائیے " اور اس سے پیشتر کہ وہ کچھ بول یا حرکت کر سکیں ۔ اس نے ان پر پھسل کر میز پر سے اخبار اٹھایا اور جیسے ہی غصّہ ہو کر ایثار نے گردن موڑی بڑے ماہر جیب کترے کی طرح نہایت صفائی سے نوٹ بھی انگلیوں میں سرکا لیا ۔ اور پھر آناً فاناً سیدھا ہو کر اخبار ایثار کے گھٹنوں پر پھیلا کر بولا "

" یہ دیکھئے ۔ ذرا اس کا نام تو پڑھئے ۔ یہ فلم ضرور دیکھئے ۔ ایسا عمدہ کام ہے اس میں دلیپ کمار کا دولھا بھائی آپ عش عش ــــــ"

" اُدھر ہٹو میاں ۔ یہ کہاں میری گردن پر سوار ہوئے جا رہے ہو تم یہی واہیات فلمیں ہی دیکھنا ۔ اور ۔ خبردار تم بھی مت دیکھا کرو ۔ میں کہتا ہوں آخر سب نے تم کو اس قدر شتر بے مہار کیسے بنا دیا ہے ۔ دن بھر عجیب عجیب واہیات حرکتیں کرتے پھرتے ہو ..... یہ تمہارے ہاتھ میں بسا بند کا ہے کی ہے "

" مینڈک پکڑ رہا تھا گڑھے میں ! "

" کیا ؟ "

جی ہاں۔ وہ آپ کی نئی مالی صاحبہ سجود بی بی نے فرمائش کی تھی کہ گڑھیا میں مینڈک کے بچے کلبلا رہے ہیں۔ ایک پکڑ دو۔ کاغذ کی ناؤ میں بٹھال کر تیرا دوں گی۔ میں نے پکڑ کے دے دیا!"

اچھا میں ابھی دھوئے آتا ہوں!"

ایثار!" باہر سے منصور نے آواز دی"

آیا!" ایثار جان چھڑانے کے انداز میں اٹھ کر چلے گئے" وہ باجی کے پاس پھر آبیٹھا۔ اب ننھا ان کی گود میں سو رہا تھا۔ ہشام بڑے شوق و محبت سے اس پر جھک گیا۔ کچھ دیر آپ ہی آپ ہنستا رہا پھر بولا" باجی۔ آپ نے غور کیا۔ اس کے فیوچر سب میرے ایسے ہیں مثلاً ـــــــ"

بات کاٹ کر ماہرہ نے کہا" فیوچر نہیں اُلو۔ انہیں فیچرز کہتے ہیں مطلب یہ کہ خط و خال، ناک نقشہ، بے وقوف۔ انگریزی کیوں بولتا ہے جب آتی نہیں اُدھر۔ آپ میری بات سنئے" اس نے لاپرواہی سے ہاتھ ہلایا" میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ بالکل میری طرح حسین ہے۔ اتنی ہی اونچی خوشنما ناک ہے جیسی میری ہے۔ ویسے ہی یاقوت کی پنکھڑیوں کے سے ہونٹ ہیں اور کیا نام۔ صود کی سی لمبی گردن۔ باجی میں جب آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں تو دنگ رہ جاتا ہوں۔ مجھ سی حسین صورتیں بھی اللہ میاں نے کم ہی بنائی ہوں گی۔ اپنے گھر میں دیکھئے۔ ڈیڈی۔ چچا میاں اور پھوپھا ابا سب کے سب بُوہی آدمی کی شکلیں لے آئے ہیں۔ اور بھائی جان اور دولہا بھائی تو خاصے بدشکل ہیں۔ آپ کے میاں کے منہ پر ابا بیلی مونچھیں۔ ہنھ۔ کوئی صورت ہے نگوڑی۔"

ہوں!" باجی پھنکاریں" آیا ہے کہیں سے بڑا خوب صورت۔ بالکل بندر جیسے!۔ پکوڑی سی ناک۔ اور ـــــــ"

ارے بھئی ماہرہ !" اچانک پھر ایثار احمد کمرے میں آئے۔ چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔ دونوں ان کی آواز سُن کر ادھر متوجہ ہو گئے۔ ہشام کا چہرہ شرارت کے مارے چمک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ آنکھوں سے قہقہے لگا رہا ہو۔ مگر اس پر غور کون کرتا۔ ایثار احمد نے کچھ کھسیا کر ہنستے ہوئے کہا:

میں کہہ رہا تھا۔ کمرے میں تمھیں کوئی نوٹ تو پڑا نہیں ملا۔؟"

نوٹ؟" ماہرہ بولیں:

ہاں۔" ایثار احمد نے کرتے اور پاجامے کی جیبیں ٹٹولتے ہوئے کہا۔ صبح تک میں نے دیکھا کہ میرے پاس تھا۔ مگر اب جو منصور کے ساتھ باہر جانے لگا تو دیکھا کہ غائب۔ ہشام۔ یار تم نے تو کہیں نہیں دیکھا"

پانچ روپے کا تھا!" نہایت بھولپن سے ہشام نے پوچھا"

سَو روپے کا تھا بیٹا" ایثار احمد نے کہا:

" دو تھا بھائی۔ میں نے عرصہ پندرہ سال سے کوئی سو کا نوٹ نہیں دیکھا۔ جاہل مطلق ہوں نا۔ مجھے دیتا ہی کون ہے۔ لپّا ڈُگی کر کے سنبھا کر لئے بہت سے بہت پانچ روپے کہیں سے مار لئے تو مار لئے ورنہ ——"

میں یہ سب نہیں پوچھ رہا ہوں" ایثار جھنجھلا گئے:

آپ دوسرے کپڑوں کی جیبوں میں دیکھئے" ماہرہ نے کہا" یہاں تو صبح ہی رمضانی جھاڑو دے گیا۔ ہوتا تو اسے ملتا!"

" ہاں ہاں" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے اور پُر تفکر انداز میں سگریٹ کے مدھم مدھم کش لیتے چلے گئے!۔ ہشام نے باجی کی نظریں بچا کر اپنی جیب میں پڑے نوٹ کو چُرمرایا اور بولا"

بڑی بُری عادت ہے۔ اپنے پیسے دیکھ سنبھال کر رکھنا چاہئے۔ مگر سچ

کہئے۔ آپ نے تو نہیں مار لئے؟"

"بکے جائے گا بس" وہ قدرے برہم ہو گئیں "میں کیوں مارتی۔ ضرورت ہی کیا ہے"

"ممی تو یہی کرتی ہیں" وہ بے حد خوشدلی سے ہنسنے لگا! "ڈیڈی کے پیسے بڑے اطمینان سے چرا لیتی ہیں۔ اور ڈیڈی کے پوچھنے پر دونوں میں خاصی جھڑپ ہوتی ہے۔ کیا مجال کہ ممی اقرار کریں۔ ڈیڈی ہی ہارتے ہیں اور پھر جب ڈیڈی صاحب باہر چلے جاتے ہیں تو ممی بڑے اطمینان سے چرائے ہوئے پیسے گنتی ہیں خوش ہو ہو کر ہنستی ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں باجی۔ ممی نے اب تک پانچ چھ ہزار تو اکٹھے کر لئے ہوں گے؟"

"چل جھوٹے۔ چچی جان ایسا نہیں کر سکتیں" ماہرہ ہنسنے لگیں۔ "ارے آپ کیا جانیں" وہ بھی ہنسا "اچھا اب لائیے۔ اسے میری گود میں رکھ دیجئے۔ کب سے میں تڑپ رہا ہوں۔ وہ چاروں چڑیلیں مجھے بچے کو لینے ہی نہیں دیتیں"

وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

ماہرہ مسکرائیں اور منے کو اٹھا کر اس کی گود میں رکھ دیا۔ ہشام اچانک بیقرار ہو گیا۔ اور بچے کو بازوؤں میں سنبھال کر بڑے والہانہ انداز میں اسے پیار کرنے لگا۔ ماہرہ اس کو اس دیوانہ وار محبت سے بہت متاثر ہوئیں۔!

کچھ دیر خاموش رہ کر خود کو سنبھالا گئیں پھر پوچھا "ہشام۔ میں تو مہینوں بعد میکے آتی ہوں۔ مجھے یہاں کے حالات کا علم نہیں ہوتا۔ مگر اب یہ میں نے دیکھا کہ امی، چچی جان، پھوپھی اماں یا گھر کے مرد تمہارا کوئی خیال نہیں کرتے۔ یونہی جانور کی طرح پھرا کرتے ہو۔ وقت آیا کھا پی لیا۔ رات ہوئی سو گئے"

میں پوچھتی ہوں بیٹے۔ اگر کسی کو تیرا خیال نہ ہو نہ سہی۔ تجھے اپنا بھی کچھ ہوش ہے کہ نہیں؟"

"میں ان پڑھ ہوں نا باجی" اسنے بے حد دردناک لہجے میں کہا: "میری کوئی اہمیت ہی نہیں ہے اس لئے میرا کوئی کیا خیال کرے گا۔ کھانا پانی کپڑے ملتے ہیں۔ بس یہی بہت ہے!"

"پاگل دیوانے" باجی نے کہا: "کیا ساری زندگی یونہی گزار دوگے۔ زمانہ تمہارے لئے یونہی رہے گا جیسا ہے۔ بھیا۔ سنو۔ دن ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ نجانے کب کیا وقت آئے۔ فرض کرو کہ کل کو کوئی تمہاری کفالت نہ کرے۔ یا تمہیں خود بھی کسی کی دست نگری اچھی نہ لگے تو پھر۔ تم کیا کرو گے۔ تب وقت نکل چکا ہو گا۔ آج کی سی آسانیاں نہیں رہیں گی۔ ابھی تمہارا شمار لڑکوں میں ہے۔ آگے تم مکمل مرد بنو گے۔ تمہاری شادی بیاہ کا مسئلہ در پیش ہو گا۔ سوچو کہ کون تم کو اپنی بیٹی دے گا۔ اب تو یہ ہوتا ہے کہ لڑکے والے پوچھتے ہیں کہ لڑکی کیا پڑھی ہے۔ تمہارے بارے میں لڑکی والے پوچھیں گے کہ لڑکا کیا پڑھا ہے۔ کیا کرتا ہے؟ تب ہم سب کیا جواب دیں گے۔ اور تم کیا سوچو گے۔ پچھتاؤ گے کہ ہائے میں نے وقت گنوا دیا۔ کسی کی نہ سنی۔ مگر تب پچھتائے کیا ہوگا۔"

ہشام کا چہرہ مارے فکروں کے ستار کی طرح لمبا ہو گیا۔ اور گویا دہشت کے مارے نطق ہی سلب ہو کر رہ گیا۔ بمشکل تھوک نگل کے وہ بولا۔

"پھر۔ پھر۔ باجی۔ اب میں کیا کروں!"

"تم نے "ان" کے بلوائے ہوئے ٹیوٹر صاحب کو بھی تنگ کرکے بھگا دیا۔ ورنہ کچھ پڑھ ہی لیتے۔ وہ تو بڑے دعوے کرکے آئے تھے۔ اپنا سا منہ لیکر

چلے گئے۔ سچ کہو۔ کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تمہارا شمار بھی تعلیم یافتہ لوگوں میں کیا جائے ؟"

"ارے باجی بے حد جی چاہتا تھا۔ مگر تیسری جماعت میں چار بار فیل ہو گیا تو میرا دل ٹوٹ کے کرچی کرچی ہو گیا پھر ہمت ہی نہ ہوئی !"

اتنے میں ننھا کلبلایا۔ اسے سنبھالنے میں ان کی گفتگو ادھوری رہ گئی۔ پھر کسی کام سے بھابی بھی آ گئیں۔ ان کے ساتھ سعود اور سارہ بھی تھیں۔ اب ہشام کا گذر یہاں کہاں تھا۔ مگر وہ ڈھیٹ اور مگرا بنا بیٹھا رہا اور لاپرواہی سے کوئی فلمی دھن گنگناتا رہا۔

بھابی نے چُرمُر کرتا ہوا ایک پیکٹ باجی کے سامنے پھینکا۔ اور ہنس کر بولیں۔ "سسرال میں یہ پہلی عید ہے نا۔ ساڑی آئی ہے۔ دیکھو بھلا کیسی ہے ؟"

باجی نے زن سے لفافہ اٹھایا۔ اور للچائیں "اُئے ہے۔ رانی کلر۔ کام بھی بے حد نفیس سا ہے۔ تمہارے رنگ پر بڑی کھلے گی ! مبارک ہو"

باجی" سارہ بولی "کل چھ عدد بکرے بھی آئے ہیں۔ مگر میرا ایک دوپٹہ ہی نہیں آ سکا !"

میری کون سی چیز آئی ہے۔ مردے نکلا ایک رومال تک نہ آ سکا"

ہشام نے گرہ لگائی۔

"آپ کو کہاں جانا ہے۔ ہمیں تو کالج جانا پڑتا ہے" سارہ بولی۔

"تو کیا۔ بیوی۔ کیا میرا دل نہیں ہے۔ پہننے اوڑھنے کو جی نہیں چاہتا؟" ہشام نے خالص بوار یمن کے لب و لہجہ میں جواب دیا "یہی عمریں ہر قسم کے شوق کی ہیں۔ بڑھاپے میں تو نگوڑا دل یونہی مردہ ہو جاتا ہے !"

اے بیٹے دل چھوٹا نہ کرو" بھابی نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا"

اللہ رکھے بہت جیو گے۔ بہت بڈھے ہو گے۔ اگر ایسا ہی جی رندہ گیا ہے تو
کل عید کے دن میری یہ نئی ساڑی باندھ لینا۔"

"بھابی آپ کے پتلون بشرٹ پر قناعت کر لیں گی۔" مسعود بولی۔ ہشام
بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا۔ وہ بہت دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ مسعود کی نظر
کرم اس پر تھی۔ ہر وقت اسے نگاہ میں رکھتی۔ جہاں وہ ہوتا وہاں کوئی نہ کوئی
کام نکال کر جا پہونچتی۔ اس کا اڈہ پھوپھی اماں کے یہاں جمتا۔ اور مسعود وہاں
بھی چلی آتی۔ خواہ مخواہ چھیڑ چھیڑ کر باتیں کرنے کی کوشش کرتی۔ ایک دفعہ اس
نے ہشام سے اشعار کی بیاض بھی مانگی تھی۔ وہ گڑبڑا کر ٹال گیا۔ بیاض تھی ہی
کب جو دیتا۔ کئی دنوں تک وہ اس کا پیچھا لئے رہی تھی۔ چاہے کسی نے توجہ کی
ہو کہ نہ کی ہو۔ مگر ہشام کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ اس قسم کی یہ دلچسپی اور مہربانی
بے سبب نہ تھی۔ اگر جیسے جیسے وہ اس کا سایہ بننے کی کوشش کرتی۔ وہ پیچھا
چھڑا کر بھاگتا۔ اُسے وحشت ہوتی۔ کسی نے مسعود کی یہ والہانہ دلچسپی بھانپ لی
تو کیا ہوگا؟ مسعود تو ایک دن اپنے گھر چلی جائے گی۔ لیکن یہاں تو بزرگ حضرات
اس کی بوٹیاں کاٹ کے چیل کوؤں کو کھلا دیں گے۔"

انہیں مہمل گفتگو میں مبتلا چھوڑ کر وہ چپکے سے اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔
نیچے کمپاؤنڈ میں منصور کے چپراسی قربانی کے جانوروں کو باندھ رہے تھے۔
وہاں دوسرے بچے بھی کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی ابرار کو گود میں
لئے اُن سب میں جا کھڑا ہوا۔ اور بچوں کی دلچسپ باتوں میں اپنی الجھنوں کو
بھلانے کی کوشش کرنے لگا۔"

بہت دنوں قبل کچھ ایسا ہوا تھا کہ۔ ہشام اور سارہ اپنے باغیچے میں جامن
کے پیڑ تلے بیٹھے کھیل رہے تھے۔ دراصل وہ کارڈ بورڈ کے تختوں کو جوڑ کر

سائرہ کی لاڈلی بلی ہنی کا گھر بنا رہا تھا۔ اور سائرہ اپنی گول مٹول سی سفید ریشم کی سی بلی کو گود میں لئے بیٹھی تھی! ۔ وہ دونوں بچے کسی بات پر رہ رہ کر ہنس پڑتے:

ایک طرف پتھر کی بنچ پر افتخار صاحب کی بیگم انصار صاحب کی بیوی سے باتیں کر رہی تھیں۔ گاہے گاہے ان کی نگاہیں ان بچوں پر بھی پڑ جاتیں۔ انہیں یوں محسوس ہوتا کہ یکبار گی ہشام ایک بھاری بھرکم مرد بن چکا ہے۔ سائرہ اب بچی نہیں رہی۔ وہ بے حد خوبصورت دوشیزہ ہے۔ اور ہشام کی بیوی بن گئی ہے۔ دونوں میاں بیوی اپنے گھر کے آنگن میں بیٹھے ہنسی بول رہے ہیں۔ پھر بلی نے ایک بچے کا روپ دھار لیا۔ ہشام کا بچہ۔ جسے سائرہ گود میں لئے بیٹھی ہے:

کیسا سہانا اور دلکش تخیل تھا!:

انہوں نے ایک بار پھر بچوں پر نظر دوڑائی اور ہلکی سی سانس لے کر رہ گئیں۔

"ادئی بڑی آپا۔ یہ آخر ہے کیا۔ کئی بار سن چکی ہوں۔ لمبی لمبی آہیں بھر رہی ہو کوئی یاد آرہا ہے کیا؟"

نوج دور پار۔ میرا کون لگا سگا ہے جو یاد آئے گا۔ سب چاہنے والوں کو گاڑ تو پہلے بیٹھ رہی ہوں۔ اب اللہ سلامت رکھے جینے والوں کو انہی کو دیکھ کر زندہ اور خوش رہنا ہے" بیگم افتخار نے جواب دیا "میں سوچتی ہوں عزیزہ بہن۔ موت حیات کس نے دیکھی ہے۔ جو آج ہے وہ کل نہیں۔ نجانے کیسا وقت کب آئے۔ یوں سب اللہ اچھا ہی اچھا کرے۔ مگر بہت جی چاہتا ہے کہ اپنے سامنے اپنے بچوں کو گھر بار سے لگا دیں"

"تم قنوطی بہت ہو گئی ہو بڑی آپا" عزیزہ بیگم نے کہا "جب سے تمہاری اماں گزری ہیں۔ تم وہ پہلے کی سی زندہ دل خوش مزاج اور چونچال رہی ہی نہیں ہو۔ مایوس خیالوں کا بار دل پر سے ہٹاؤ۔ غمناک باتیں سوچ سوچ کے آدمی وقت

سے پہلے ختم ہو جائے۔ اللہ چاہے گا تم اپنے سامنے سب کی شادیاں کرو گی۔ منصور کی بات چیت لگ گئی ہے۔ طاہرہ کا سلسلہ بھی چل ہی رہا ہے۔ اور دوسرے بچے بھی بہت چھوٹے ہیں۔ ان کا کیا!"

"میرا تو جی چاہتا ہے کہ —" بیگم افتخار کہنے چلی تھیں کہ دونوں بچے آ نکلے پاس آ کھڑے ہوئے۔ ہشام کے ہاتھ میں نا مکمل سا چھوٹا خوبصورت سا گھر تھا۔ سارہ خوش ہو ہو کر اچھل رہی تھی!"

"چچی اماں دیکھئے۔ دیکھئے۔ سارہ کی بنی کا گھر" ہشام کا چہرہ فرط مسرت سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ گویا اپنے فن کی داد چاہنے کے لئے ماں اور چچی کو بار بار دیکھ رہا تھا!۔ اور گویا ان کی آنکھوں میں گھر گھونسلے ڈھونڈ رہا تھا۔"

"بہت پیارا ہے" بیگم افتخار بولیں "اب بنی اسی میں آرام سے رہے گی۔ جو پکڑ کے لائی اگر۔ تو وہ بھی اپنے ڈائننگ روم میں بیٹھ کر کھائے گی"

"اس بار بچے ادھر والے کمرے میں رہیں گے" سارہ بولی۔ اس کا بھولا بھالا چہرہ بھی تمتما رہا تھا"

"اچھا اچھا۔ پہلے پورا گھر بنا تو لو" ہشام کی امی نے کہا۔ بچے پھر مڑ گئے۔ "کیسے اچھے لگتے ہیں یہ دونوں" بیگم افتخار کہہ رہی تھیں "میری تو یہی تمنا ہے کہ سارہ تمہارے ہشام کی دلھن بنے۔ اور میرے ہی گھر میں رہے جیسے ہم سب ایک رہے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک۔ پروردگار ان بچوں کو بھی یہی توفیق دے۔ کبھی ان میں پھوٹ نہ پڑے۔ جیسے ہم نہیں بچھڑے۔ اللہ کرے یہ بھی نہ بچھڑیں!"

ہشام نے پلٹ کر دیکھا"

اس کی ممی ہنس رہی تھیں "ارے بڑی آپا۔ ہشام اور سارہ تم سے دور

کہتے ہیں۔ ابھی چاہو ابھی دونوں کا نکاح پڑھا دو۔ اس میں انتظار کس بات کا ہے۔ ہشام کیا تمہارا نہیں ہے بھی نے اسے پالا پوسا ہے اس پر سچ پوچھو تو پورا حق تمہارا ہی ہے !"

"اللہ کرے کہ میری مراد پوری ہو !"

ہشام جلدی سے آگے بڑھ کر سارہ کے پاس جا بیٹھا اور سرگوشی میں بولا۔

تم نے سنا، چچی اماں کیا کہہ رہی ہیں ؟"

نہیں" سارہ نے کالی کالی پلکیں جھپکا ئیں۔"

وہ مسکرایا" کہہ رہی ہیں کہ ہشام کا بیاہ سارہ سے کر دیا جائے۔"

"سچ سچ !!" سات برس کی بھولی بھالی بچی نے خوش ہو کر کہا۔

ہاں !" میں نے سنا ہے ابھی ابھی" بارہ برس کے لڑکے نے بھی خوش ہو کر جواب دیا۔"

تم کہہ دو گے مجھ سے بیاہ ؟"

ضرور کروں گا۔ تم اتنی گوری گوری ہو۔ کتنی اچھی لگتی ہو۔ پھر میں دولہا بنوں گا"

اور کیا"

"گھوڑے پر بیٹھ کر آؤ گے کہ پھولوں والی موٹر میں ؟"

گھر کی تعمیر کا کام رک گیا۔ اور مستقبل کے معمار اپنے گھر کا نقشہ تیار کرنے لگے۔

میں کیا جانوں۔ مجھے گھوڑے پر بیٹھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر تم بتاؤ تمہیں کا ہے پر بیٹھ کر آؤں ؟"

"موٹر میں۔ لال لال موٹر میں۔ اسے سرخ کے پھولوں سے خوب سجانا۔

اچھی خود! باجی کا دولہا کتنی اچھی موٹر میں آیا تھا۔ اور سنو۔ بیاہ میں خوب
سے باجے ضرور بجوانا۔

ضرور۔ باجے تو بجیں گے ہی۔ جب باجے نہ بجیں تو بھلا کہاں بیاہ ہوتا ہے۔
میں خوب سارے باجے لاؤں گا۔ اچھا!

چھتنار شیروانی پہنو گے؟

ہاں۔ اور تم؟

میں بھی خود باجی کے سے خوب لال لال رم جھم کرتے کپڑے پہنوں گی۔
ہاتھ پیروں میں مہندی لگاؤں گی۔ بہت سے چھم چھم کرتے گہنے پہنوں گی۔
امی کی صندوقچی میں جو ٹیکہ رکھا ہے نا۔ تم نے دیکھا!

ہاں ہاں۔ جس میں بہت سے نگ جڑے ہیں؟

وہی۔ میں اسے ماتھے پہ سجاؤں گی۔ اور پھر تمہاری دلہن بن جاؤں گی۔
مگر۔ وہ اچانک گال پھلا کر روٹھ گئی۔

کیا ہوا؟ ہشام گھبرا گیا۔

تم اچھے دولہا نہیں ہو!

اچھا دولہا نہیں ہوں؟ ہشام حیران رہ گیا۔

نہیں۔ تم ہماری چوٹی کھینچ لیتے ہو۔ ہم اتنے اچھے بال بناتے ہیں تم بگاڑ
دیتے ہو۔ گڑیوں کی شادی کے بتاشے اور مٹھائی کھا لیتے ہو۔

پھر تم بھی تو میرے کاٹ کھاتی ہو۔

واہ شامی بھیا واہ۔ کہیں دولہا دلہن بھی آپس میں لڑتے ہیں!

اچھا سائرہ۔ میں اب کبھی تمہاری چوٹی نہیں کھینچوں گا۔ کبھی تمہاری گڑیا
کی شادی کی مٹھائی نہیں کھاؤں گا۔ لو لو۔ اب تو میں اچھا دولہا ہوں نا؟

"ہاں!" وہ مسکرائی "اب میں بھی تمھیں نہیں کاٹوں گی"

معاہدہ بڑا پختہ اور زبردست تھا مگر زیادہ دن چلا نہیں۔ ایک مرتبہ اس کی خلاف ورزی ہوئی اور پھر دونوں فریق ایکبار پھر جانی دشمن بن گئے۔ دشمنی کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔ اور عمروں پہ محیط ہو گئی۔

سامرہ کے ذہن میں بچپن کی بات محفوظ ہی نہیں۔ یا وہ ایسا ظاہر کرتی تھی کہ وہ سب کچھ فراموش کر چکی تھی۔

لیکن ہشام کے دماغ سے بچپن کا معاہدہ نہ نکل سکا۔ بلکہ وہ تو ہر گزرنے والے دن کے ساتھ تازہ اور جوان ہوتا رہا۔ اظہار اس نے کبھی نہیں کیا۔ لیکن وہ خیال ہزار پا کی طرح پنجے گاڑے اس کے ذہن سے چمٹا رہا تھا۔ وہ اسے کھرچ کے پھینک بھی نہ سکا!

اور پھر یہ حادثہ بھی ہوا کہ۔ آگے چل کر ہشام نرا بدشوق۔ کند ذہن اور جاہل نکلا۔ جبکہ سامرہ نے اچھی خاصی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ اس کے چونچلے بڑے تھے! ہشام کی ممی بے چاری اپنی جگہ مجبور بن کر رہ گئی تھیں۔ محض منھ سے سامرہ کو بہو بنانے کا خیال ظاہر کرتیں۔ ہشام کو البتہ خوب رگید کر دبا رکھا تھا۔ خوب سرتارا تھا۔ ہزار سرزنش کی تھی۔ غیرت اور جوش دلایا تھا۔ مگر وہ تو دریا کا وہ پتھر تھا۔ جسے لہریں جتنی لاکھ کوشش کریں۔ اپنی جگہ سے جنبش نہ دے سکتی تھیں۔ آخر کار تھک ہار کے وہ بے چاری آپ خاموش ہو گئیں۔

اور سامرہ کی امی تو بڑی آزردہ رہا کرتیں۔ انھیں ہشام بہت پسند تھا صورت شکل کا اچھا۔ ہاتھ پاؤں کا ٹھیک، چال چلن درست۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے حسب نسب کا۔ چھان بین کی ضرورت نہیں۔ اور پھر یہ کہ اپنے گھر کا لڑکا۔ سامرہ کو رخصت کرا کے کہیں لے نہ جاتا۔ بس وہ باپ کے گھر

سے جل کر سسرال کے گھر میں جا بیٹھتی۔ مگر اب تو ساری امیدوں پر برف کا پانی پڑ گیا تھا کہ ساری امیدیں یخ بستہ ہو کر رہ گئی تھیں!"

صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ عزیزہ بیگم اپنی طرف سے عمدہ پیغاموں کی نشان دہی کرتیں!۔ اور انہوں نے اپنی جٹھانی سے وعدہ بھی کر رکھا تھا کہ اگر انکے میکے میں کوئی بھی اچھا لڑکا نکلا تو وہ اسے سامرہ کے لئے رجسٹرڈ کر لیں گی"

اور ہشام تھا کہ لڑکیوں کے ککڑی کی بیل کی طرح بڑھ جانے کی مثال کو شکست دے رکھی تھی!" ابھی گویا کل گھٹنیوں بڑا بڑ کرتا تھا۔ اور دیکھتے دیکھتے باپ اور چچا کے قد سے کہیں بڑھ اونچا نکل گیا۔ کبھی تو یوں لگتا کہ جیسے بڑے بھائی سے بھی کچھ نکلتا ہوا ہو۔ چنانچہ مذاق میں منصور اسے اونٹ اور تاڑ کا درخت کہتے تھے۔ افتخار صاحب کا خیال تھا کہ ہر روز صبح کو جب وہ سو کر اٹھتا ہے۔ ایک انچ اور لمبا ہو جاتا ہے!۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کی جہالت اور حماقت میں بھی ایک انگل بھر اضافہ ہوتا ہے!"

خدا خدا کر کے عید کا دن آ ہی گیا۔ قدرتی طور پر ایسے خاص دنوں میں گہما گہمی تو ہوتی ہی ہے۔ لیکن اس روز تو سامرہ نے اپنی خوشیوں کو جیسے طاق نسیاں پر رکھ دیا۔ وہ اپنے کمرے کی تھی۔ نہ نہائی دھوئی نہ بال بنائے۔ چار روز پہلے کے پہنے کپڑے پہنے سوتی جاگتی اور جان بوجھ کر انہی امی کے سامنے سے گزرتی رہی۔ مگر انہوں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ بلکہ ایک دفعہ پھٹکار کر جو چہرہ پھیرا تو سامرہ سرد ہو کر اپنے کمرے میں آ بیٹھی۔ منصور اس کی خوشامد میں کر کر کے ہار گئی۔

پھر بولی"

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں بھی کپڑے نہ بدلوں!"

"نہیں۔ تم جاؤ۔ خوب اچھے اچھے کپڑے پہنو اور جاؤ ملنے جلنے سب سے۔ میں تو قسم سے آج باہر بھی نہ نکلوں گی!" سائرہ کے گال بھیگے جا رہے تھے۔

"ہائے سائرہ۔ تم خالہ بی کی ناراضگی مول لے رہی ہو" مسعود بولی "ایسا نہ ہو کہ کہیں ——"

دفعتہً بیگم افتخار نے سائرہ کو آواز دی۔ وہ اچھل پڑی۔ اور ڈرتی ڈرتی بھی جھجکتی سی باہر نکلی۔ آج ان کا موڈ جانے کیوں آف تھا۔ سائرہ کو دیکھا اور برس پڑیں۔

"میں کہتی ہوں۔ آخر ہوا کیا ہے۔ عید کے دن نحوست پھیلا رہی ہو۔ جاؤ نہا دھو کر کپڑے پہنو۔ اور خبردار میرے سامنے پھر دوپٹہ کا نام لیا تو وہ سب کپڑوں میں بھی آگ لگا دوں گی!۔ لڑکی۔ مجھ سے مقابلہ کر رہی ہے کیا۔ پھر نکل آئے تیور! لو اور سنو۔ ماں کو سزا دے رہی ہیں۔ آخر میری عابدہ بھی تو ہے۔ اللہ رکھے بچوں والی ہو گئی ہے مگر اب بھی یہ حال ہے کہ میرے منہ سے بات نکلی نہیں کہ میری بچی پوری کرنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ دل سے دعائیں نکلتی ہیں اس کے لئے۔ جبھی تو سسرال میں راج رچا رہی ہے۔ ساس سسر کی آنکھوں کا تارہ بنی ہے۔ ان بی بی کو دیکھو ہے کہ پرائے گھر جا کے مجھے کیا ٹھکوائی ہیں"

"ثریا پا۔ کوسئے تو نہیں" چچا ابا نے سفارش کی "بچی ہے۔ بچی ہے۔ آپ سے دلار نہ کرے گی بے چاری تو پھر اور کون ہے؟ مجھے یاد آ رہا ہے کہ بچپن میں ایک دفعہ میں بھی اماں مرحومہ سے ایسی ہی ضد کر رہا تھا کہ مجھ کو بہت نہیں کسی چیز کا مطالبہ کر رہا تھا۔ شاید۔ یہ کہہ رہا تھا کہ فاتحہ سے پہلے مجھے

تل دیں۔ ارے ہاں۔ نیرہ نے کہا۔ سلیمہ۔ بکروں کے گلے پر تو منصور میاں نے اتنے اکڑ اکڑ کر چھری چلا دی ہے اگر قصائی نے بھی نکالی ہو تو بھائی ذرا اتنی تھی سی بوٹیاں تل ڈالنا۔ اب تو بھوک کے مارے آنتیں اینٹھی جا رہی ہیں۔ آج ناشتہ بھی نہیں ہوا ہے:

بجیا بگڑ گئیں۔ اچھا بدنام کرتے ہو آپ۔ ارے ناشتہ تو آپ نے دوسرے دنوں سے زیادہ کیا ہے۔ چار پراٹھے ڈبل بیضے۔ دو پیالی کافی۔ پھر ابھی سے کیوں آنتیں اینٹھنے لگیں۔ سر میں میرے درد ہو رہا ہے۔ میں تو ابھی دیگچی ٹلنے کی نہیں:

ساجدہ اپنے کمرے میں آئی۔ ڈانٹ کھا کر اس کا موڈ بھی تباہ ہو گیا تھا۔ غصے کے مارے الماری کھسوٹ کر رکھ دی:۔ اور سارے کپڑے فرش پر گرا دیے:

کیا ہوا بھائی۔ بے جان چیزوں پر کیوں غصہ اتار رہی ہو:۔ مسعود بولا۔ ساجدہ چیں بجبیں ہوئی: دوپٹے کا جنازہ تو نکل ہی گیا تھا۔ اب دیکھو کم بخت بڑے سوٹ شرٹ کا بھی پتہ نہیں۔ جانے کہاں غارت ہو گیا!:

دوسرے پہن لو!: مسعود نے رائے دی:

دفعتہً دالان میں بڑے بڑے قہقہے گونج اٹھے۔ ان دونوں نے بھی باہر جھانکا اور بے ساختہ ہنسی نہ روک سکیں!۔ ان سب کے سامنے ہشام عجیب سی مضحکہ خیز ہیئت کذائی میں کھڑا تھا!:

ارے۔ یہ کیا نظر آ رہے ہو: باجی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکیں: یہ سوانگ کیا رچایا ہے:

ہشام پتلون پر بھیو بابا کی زبردست شیروانی پہنے کھڑا تھا۔ شیروانی ایسی تھی کہ شاید اس میں چار پانچ ہشام سما جاتے!۔ آستینیں انگلیوں سے

بالشت بھر آگے جھول رہی تھیں! ۔ اس کی ٹھڈی کالر میں کھو گئی تھی! ۔ اور دامن گھٹنوں سے نیچے تک آگئے تھے!"

"کیوں ۔ کیا ہوا ۔ میں اس شیروانی میں اچھا نہیں لگ رہا ہوں کیا؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"توبہ کرو ۔ یہ سوجھی کیا ہے؟" باجی بولیں "نہ نماز پڑھی ۔ نہ کسی سے گلے ملے ۔ یہ شامیانہ لاد کر چلے آئے ۔ جاؤ ۔ اتارو جھٹ ابا کی شیروانی!"

"ہمیشہ احمق ہی رہے گا!" بھائی صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اچھا ۔ میں ان لوگوں سے مل آؤں تو اتار دوں گا!" ہشام نے کہا ۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا سائرہ کے کمرے تک آیا ۔ لڑکیاں بھاگ کر بیچ کمرے میں آگئیں ۔ دوسرے لمحے ہشام نے پردا سرکایا اور اجازت لیئے بغیر کمرے میں آیا۔ سائرہ ہنسی کے مارے بیقرار ہو کر صوفہ پر گری اور مسحور نے آنچل منہ میں ٹھونس لیا"

"اوہو ۔ کیا میں سچ مچ خوبصورت نہیں لگ رہا" ہشام نے ان کی ہنسی سے نروس ہو کر کہا"

"بھالو" سائرہ نے کہا"

"شکریہ" اس نے برا مانا ۔ اور غصے ہو کر شیروانی اتار کر صوفہ پر پھینکی اور دروازے کی طرف مڑتا ہوا غصیلے لہجے میں بولا"

"اچھی بات ہے ۔ جا رہا ہوں ۔ اکیلے! خود ہی بیٹھو ۔ خدا حافظ ۔ عید مبارک" اور ایک جھٹکے سے پردہ سرکا کر باہر نکل گیا"

لباس وغیرہ تبدیل کر کے جب دونوں اپنے بزرگوں سے ملنے اور سلام کرنے کے لئے باہر آرہی تھیں ۔ تب مسحور بولی"

اس کمال کو بھی لیتی چلو۔ کیا یہ یہیں پڑی رہے گی!"

"یہ پیا ابا کی ہے۔ لاؤ میں اٹھا لوں!" سامرہ نے کہا۔

اچانک مسرور ہلکے سے چیخ پڑی۔ وہ تیزی سے شیروانی کی جیبوں کا جائزہ لے رہی تھی! اور دھک سے رہ گئی تھی۔ سامرہ نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں اس کا اپنا نیا شرٹ اور اس کا ہمرنگ نہایت نفیس اور خوبصورت نیا دوپٹہ تھا۔ مسرور متحیر تھی اور سامرہ تو جیسے بت بن گئی تھی۔ پھر وہ سنبھلی اور جھپٹ کے دونوں چیزیں مسرور کے ہاتھ سے لے لیں۔ اور بڑبڑائی۔

"تو۔ یہ بہانہ بنایا تھا۔ شیروانی اسی لئے پہن گئی تھی۔ اس کی بڑی بڑی جیبوں میں یہ چیزیں چھپائی جا سکیں۔ مگر۔ یہ کتنی ہمت کی بات ہے۔ وہ کب چپکے کمرے میں آئے تھے۔ کب شرٹ نکال لے گئے۔ اُف توبہ! نہ جانے اس کے دل میں کیسے کیسے طوفان مچل رہے تھے کہ ان کی لہروں کا عکس اس کی آنکھوں میں بھی مچل رہا تھا!"

پھر وہ ہنس پڑی اور بولی — "اب یہی پہنوں گی" اور بے حد مسرور سی یہ دولے کے اندر چلی گئی!"

مسرور کو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا! اک ذرا سی بات نے کتنی تلخ حقیقت کا روپ دھار لیا تھا اور کتنی تکلیف دہ بن گئی تھی۔ مسرور کا دل پاتال میں اترنے لگا! اچانک وہ خود کو سامرہ سے بہت کمتر اور بے حقیقت سمجھنے لگی۔ جیسے کسی نے اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو۔ اس کے سر سے چھت کا آنچل سرکا لیا تھا۔ اس کو زندگی کی کڑی دھوپ میں تنہا کھڑا چھوڑ دیا تھا۔ ٹوٹے دل کی تیز نوکیلی کرچیاں اس کے خیالوں کو زخمی کرنے لگیں۔ اس کی کچھ نہیں سمجھ آرہا تھا۔ وہ اس قدر حساس کیوں ہو رہی تھی؟! وہ یوں اندھا دھند کیا سوچتی

لگی تھی ! ۔ کیوں ۔ وہ اپنے دل کو دکھا رہی تھی ۔ ہشام نے کیا ہی کیا تھا ۔ سائرہ جو صرف ایک دوپٹہ کو رو رہی تھی ۔ وہ لے آیا ۔ ممکن ہے کہ اس نے سائرہ کو اس واسطے پہلے بھی کچھ خرید دیا ہو ۔ دونوں پیدائش کی گھڑی سے ساتھ ساتھ ہی رہے ہیں ! جانے ان کا ہمقدم شباب ایسے کتنے خوبصورت رازوں کا ضامن ہے ۔ دونوں چچازاد بہن بھائی ہیں ۔ اور مسعود تو ان کی کچھ بھی نہیں ۔ پھر ۔ وہ کیا چاہتی ہے ؟ "

اسے خود بھی پتہ نہ تھا ۔ وہ اپنی باتوں سے ۔ پلکوں کے جھپکانے سے ۔ مسکرانے کی اداؤں سے ۔ ہشام کو کون سی بات کا یقین دلانا چاہتی تھی ۔ اور ناکام رہی تھی ۔ وہ چاہ رہی تھی کہ ۔ ایسے کوئی گوشۂ تنہائی ملے اور وہ ۔ خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دے ۔۔۔۔۔"

سائرہ پھولوں کی طرح کھلی ہوئی اس کے پاس کھڑی تھی !: گلابی پھولدار لباس میں لپٹی وہ خود ایک تر و تازہ شبنم آلود پھول لگ رہی تھی !۔ اور ۔ وہ قاتل دوپٹہ ۔ جو سائرہ کے نازک کندھوں پر پڑا تھا ۔ جو اس کے سادے حسن میں چار چاند لگا رہا تھا ۔ وہ دوپٹہ جو زبان حال سے اس پر ہنسو رہا تھا یکبارگی ایک بھیانک کفن بن گیا ۔ جس نے مسعود کے تمنا بھرے ارمانوں کی لاش کو ڈھانپ دیا تھا ۔ یکبارگی آنسوؤں کا سمندر اس کی حلق میں آ کر ٹھہر گیا ۔ مگر پلکیں نم ہو گئیں آنسو گالوں پر بہنے اور وہ اپنی آب کھونے پر تیار نہیں تھے ۔ اس نے سر جھکا لیا اور ہونٹ دانتوں میں دبا لیا ۔"

"چلو چلیں ۔" سائرہ بے حد خوش تھی ۔"

مسعود کے لبوں پر ایک آہ مچلی ۔ دل میں ایک ٹیس اٹھی ۔ اس نے جلدی

سے رخ پھیر لیا اور کھانس کر بولی ”چلو!“

ہشام جانے کیوں وہیں پھوپھا ابا کے پاس بیٹھا رہ گیا تھا۔ ان سے بکواس کر کے ہنس رہا تھا!“

سارہ خوب اترا کر اس کے سامنے سے چلی گئی۔ اسے سلام تک نہ کیا۔ نہ اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور نہ ہشام نے کچھ کہا۔ بس ایک مرتبہ سارہ کو دیکھا اور پھر پھوپھا ابا کی طرف متوجہ ہو گیا!“

جی ہاں۔ جی ہاں“ وہ کہہ رہا تھا ”اسی طرح کا ایک شعر میں آپ کو سناؤں۔ ٹھہریئے۔ ذرا سوچ لوں اِ“ ابھی سناتا ہوں!“

مسعود نے ہشام کی ایک جھلکتی ہوئی نگاہ میں جانے کون کون سے گہرے جذبے کون سے طویل طویل پیغام، اور کتنی ان کہی باتیں دیکھ لی تھیں۔ وہ ایک نگاہ برسوں کے عرصہ پر محیط تھی۔ کتنے فاصلے سمٹ آئے تھے۔ ایک دفعہ پلکیں اٹھانے اور جھکانے میں!۔ کتنے بے پناہ جذبے چیخ اٹھے تھے اس پل بھر کی خاموشی میں۔۔! اسے سارہ ایک فتح یاب جنرل معلوم ہو رہی تھی۔ مغرور سا کوہ گرفتہ ایک فاتح تبسم سے پامال، و برباد کرنے والی۔ اور۔ وہ خوشنما سا بابرکت جھلملاتا دوپٹہ۔ وہ تو جیسے مسعود و سارہ کے درمیان دیوار جیسی بن گیا تھا!“

سارہ اپنی امی کے پاس تھی اور ان سے فرخی ہو ہو کر کچھ کہہ رہی تھی۔ جانے کیا۔ بس اس کے پتلے پتلے گلابی لب متحرک دکھائی دے رہے تھے۔ اور ایک دبیز دھند جو مسعود کی آنکھوں کے آگے چھائی ہوئی تھی، اس نے سارہ کے الفاظ روک لیے۔ بس وہ اسم بامسمیٰ سی ایک گڑیا بنی بے معنی نظروں سے ادھر ادھر دوڑا رہی تھی!“

اچانک ہشام نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اور بولا ”واہ پھوپھا ابا واہ۔ خوب

ذرا ایک مرتبہ پھر تو پڑھئے وہ شعر! ۔ سبحان اللہ!"
چنانچہ پھوپھا ابا نے مزے لے کر پھر پڑھا!"

بد صورتی پہ شیخ بخاری نہ جائیو
یہ وہ جانور ہے جس کا نہیں الٹا سیدھا

انصار صاحب کے کان میں بھنک پڑ گئی۔ چپکے سے اپنی بھابی سے بولے "
بڑی آپا۔ ان دو کھلونوں سے آپ کا جی تو بہت بہلتا ہوگا"
"اے ہاں، سید میاں کی باتیں۔ وہ ادھر نہیں آتے تو میں چلی جاتی ہوں ملیحہ کی طرف" وہ ہنس دیں"

پھوپھی اماں اور نجمہ بھابی کچن کی طرف سے آئیں۔ نجمہ نے رسا کی عطا کردہ نئی ساڑی پہن رکھی تھی اور سلیقے سے پہنے خوشنما گہنے پہنے بہت پرکشش اور خوبصورت نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے ایک بڑی سی ڈش ہاتھوں پر سنبھال رکھی تھی۔ اسے میز پر رکھتی ہوئی بولیں"
"پھوپھا ابا۔ آئیے۔ آپ کلیجی کھانے کی فرمائش کر رہے تھے۔ میں بہت سی تل کے لے آئی ہوں!"

"بیٹی دسترخوان بچھا کے تخت ہی پر رکھ دو۔ ہم سب یہیں کھائیں"
انصار صاحب نے کہا "میں سچ کہتا ہوں کہ دسترخوان ہی پر کھاتے میرا پیٹ خوب بھرتا ہے۔۔ میز کرسی پر نہ تو نیت بھرتی ہے نہ پیٹ۔! مگر۔ یہ کیا۔ صرف کلیجی تل لائی ہو۔ روٹیاں نہیں ہیں ساتھ میں!"
اس وقت تو یہی ڈش ہے چھوٹے چچا" وہ بولیں"
جی جی، میرا معدہ تو پھر اقرار لا رہا ہے!" انصار صاحب نے کہا "صبح کے دو توس کھا کے ٹہل آیا ہوں اور ٹھنڈی کافی تو اس دوڑ دھوپ میں نجانے کہاں گئی!"

ڈائننگ ہال کی ٹوٹی بند رکھئے بھابی۔ میں تنوری روٹیاں لے کے ابھی آیا" ہشام بولا۔ چنانچہ افتخار صاحب نے ان ٹیٹوں کی قیمت دینے کے لئے جیب ٹٹولی۔ ہشام نے انہیں روک کر کہا "جی نہیں۔ پیسے ہیں میرے پاس۔ میں ابھی لے کر آیا"

اور ٹھیک دس منٹ بعد وہ ایک بڑا سا بنڈل لئے موجود تھا۔ بڑے تختوں پر سرخ دستر خوان بچھایا گیا۔ اور پورے چھ بلروں کی ٹکیاں نہایت خوشبودار تلی ہوئی پلیٹوں میں نکالی گئیں۔ گھر کے سارے افراد بیٹھے۔ اور بے حد خوشگوار ماحول میں عمدہ ناشتہ ہونے لگا۔"

"اللہ رکھے میری دلہن کے ہاتھ میں مزہ خوب ہے" بیگم افتخار بڑی محبت سے اپنی بہو کو دیکھتی ہوئی بولیں "اب یہ میری عادت ہو جائے گی جب تک ان کے ہاتھ کی پکی کوئی چیز دستر خوان پر نہ ہوگی۔ میرے حلق سے نوالہ نہ اترے گا۔ رشیدن بوا بے چاری تو اب ٹھیک ٹھاک کے رکھنے لگی ہیں"

رشیدن بوا اور میاں رمضانی دوسرے ملازمین کے ساتھ صحن ہی کے ایک گوشے میں موجود تھے۔ افتخار صاحب کا حکم تھا کہ اگر موقع ملے اور ملازموں کو فرصت نصیب ہو تو خاص خاص موقعوں پر انہیں بھی اپنے ساتھ دستر خوان پر ضرور کھلانا چاہئے۔ اور یوں تو رشیدن بوا ہمیشہ اپنی بیوی کے ساتھ ہی کھاتی پیتی تھیں۔ وہ بولیں"

"بیگم کیا کریں ہم۔ بڈھے ہو گئے ہیں۔ سوجھتا الگ نہیں ہے۔ برسوں برسوں ارہر کی دال اور کوفتوں میں دوہرا دوہرا نمک جھونک دیا تھا۔ خالہ سنا ہو گیا تھا سب کچھ۔ اب آپ ایک خانساماں رکھ لیجئے اور ہم کو بس پنشن (پنشن) پر علیحدہ کیجئے"

نانی رہیں۔ آپ بُرا مت مانیئے" ہشام بولا "اس وقت جو چیز مزے کی پکی ہے۔ اس میں بجا بی کے خوش ذائقہ ہاتھ کا کمال نہیں ہے" بلکہ یہ تو دولہا بھائی کے نوٹ کی برکت ہے!!"

ایثار احمد چونکے "میرے نوٹ کی برکت۔ وہ کیسے۔ میں نہیں سمجھا"

ارے وہ" منصور بھی چونکے "کل پرسوں تم اپنا سو کا نوٹ ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ اسی چوٹے کو ملا ہے شائد"

کیوں میاں ؟" ایثار نے ہاتھ روک کر اسے گھورا"

بالکل صحیح ہے" ماہرہ بولیں" یہی بیٹھا تھا آپ کے پاس۔ جب آپ کا نوٹ کھو یا ہے!"

اے بیٹے اب تم اللہ نہ کرے چوریاں بھی کرنے لگے ہو" بیگم افتخار نے بڑی حیرت سے کہا"

ہرا تحم تازہ ہوگیا۔ خواہ حلق میں پھنس رہے تھا" ایثار بولے۔ ہشام بے تحاشہ ہنس رہا تھا" جناب وہ لہا بھائی صاحب۔ آپ کو بیں تمجھ ہیے مسلمان دنا بھی دے جا رہا ہوں۔ آپ اتنے بے خبر معصوم اور نیک نہ ہوتے تو اس وقت بھلا ہم یہ مزیدار ناشتہ اُڑا سکتے ؟۔ ناممکن"

مجھے ایا کیسے ؟" ایثار احمد نے حیرت سے پوچھا"

مجھے انا کیوں" ہشام بولا" خدا نخواستہ آپ نے مجھے جراچکا سمجھ رکھا ہے۔ واہ"

تو پھر" منصور نے کہا"

ارے وہ نوٹ تو خود دعوت نظارہ دے رہا تھا" ہشام نے کہا" جیب سے آدھا اوپر نکلا مسکرا کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کہتا مجھے دیکھتا ہے اور

میں اسے گودی میں لے لیتا ہوں۔ بس اسی طرح ——!"

"سمجھ گیا:" ایثار احمد نے سر ہلا کر کہا "جب تم مجھ پر پھسل پڑے تھے۔ مگر بیٹے ہضم نہ ہوگا وہ نوٹ۔ میں تم سے رکھوا لوں گا۔"

"فی الحال تو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سب کچھ ہضم ہو رہا ہے" ہشام ہنس پڑا۔

"تمھیں کیوں۔ اس کنگلے کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟" پھوپھی بولیں۔

"اب بھائی نہایت زوردار کافی بھی پلوا دو!" پھوپھا نے اپنے عظیم الشان پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور گرجیلی ڈکار لے کر بولے "بس ناشتہ مکمل ہو جائے"

"ساہرہ!" یکایک ہشام نے اسے مخاطب کیا۔

وہ چونکی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بولا "کھانے کے بعد نہایت ادب سے جھک کر دولھا بھائی کی خدمت میں تسلیمات عرض کرنا اور خوب بہت سا شکریہ ادا کر دینا تمہارا دوپٹہ بھی چوری کے اُن ہی پیسوں سے آیا ہے!"

"مجھے پیسے سے مطلب۔ چوری سے آیا ہو یا سینہ زوری سے۔ شکریہ آپ ہی ادا کر دیجیے" ساہرہ بولی۔

"بات پکی ہے" عقیدت سے ہشام نے سر ہلایا پھر بولا۔ "دولھا بھائی آپ کا بہت بہت شکریہ!"

"بچو۔ اکیلے میں ملو گے تو پھر مزا چکھاؤں گا۔ یاد رکھو گے عمر بھر۔ دھری رہ جائیں گی مکاریاں" انہوں نے دانت پیسے!

پھر کافی بنانے چلی گئیں۔ ساہرہ نے خود برتن اٹھائے اور دسترخوان سمیٹنے میں لگ گئی!

اور تینوں خواتین گوشت کے حصے بخرے کرنے اور رشتے داروں میں بھجوانے کے لیے اٹھ گئیں۔ آنگن کے دروازے پہ مسکینوں کی بھیڑ لگی تھی۔ چنانچہ

چوکیدار کے ساتھ ادھر نپٹنے چلے گئے!"

ہشام برآمدے میں آکھڑا ہوا۔ نجانے کیوں بڑا مسرور ہو رہا تھا۔ اسکے لبوں پر شریر سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی"

سب اپنے اپنے کاموں میں معروف تھے۔ سامرہ اس خیال سے بیحد خوش تھی کہ اب کل سے پھر کالج جائے گی۔ وہ اپنے کپڑوں اور کتابوں کی درستگی میں مشغول تھی"

اگر کوئی بری طرح بیزار، اکتایا ہوا اور دل برداشتہ تھا تو وہ مسحور تھی اس نے خواہ مخواہ ایک روگ اپنی جان کو لگایا تھا اور پریشان تھی!۔ وہ دل کو سکون دینے کے لئے برآمدے میں نکلی۔ یکایک پچھلی اداسیاں اور قنوطیت جو اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھیں۔ پھر اس پر عود کر آئی تھیں۔ اس کا اثر چہرے پر ہو رہا تھا!" لب خشک پپڑائے ہوئے۔ آنکھوں سے غم عیاں۔ خاموش گم صم سی!"

اس نے ہشام کو دیکھا۔ جنگلے پر دونوں ہاتھ ٹکائے نیچے جھانک رہا تھا۔ جہاں ہوا کے شریر جھونکوں نے گلاب کے تختوں پر ہلچل مچا رکھی تھی!"

آہٹ سن کر ہشام نے رخ پھیرا۔ اور بڑی مستعدی سے بولا" جناب عید مبارک۔ اُف نوہ۔ آپ اب نظر آئی ہیں۔ شرمندہ ہوں۔ مبارکباد باسی ہو گئی ہے۔

شکریہ۔ آپ نے دی تو!" مسحور بولی"

جی ہاں۔ وہ تو قاعدہ ہے" ہشام نے قابلیت سے کہا"

"اُف۔ اللہ" مسحور نے کہا" آم کے درخت پر وہ طوطا دیکھا آپ نے۔ کتنا پیارا لگ رہا ہے۔ سبز جسم۔ سرخ چونچ۔ مجھے طوطا بے حد پسند ہے"

مجھے یہ طوطے مینے نہیں پسند" ہشام نے جواب دیا" بے کار کی نمائش

لگانے ہیں۔ واہیات۔ مہمل!"

"تو پھر۔ پرندوں میں آپ کو کیا پسند ہے؟" مسعود نے پوچھا۔

"چیل!"

"کیا؟"

"جی ہاں۔ جب نہایت اونچائی پر پہنچ کر اپنی ہریا آوازیں گونجتی ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میری روح بھی اس آواز کے تال پر ناچنے لگی ہو۔ واہ واہ۔ عجیب حال ہو جاتا ہے میرا۔ میں جھومنے لگتا ہوں۔ میرے ساتھ ساری کائنات ڈانس فرمانے لگتی ہے۔ یہ بھی تو سوچئے کہ چیل ایک دولت مند اور سرمایہ دار پرندہ ہے۔ آپ نے سنا بھی ہو گا کہ چیل کے بچے جب تک سونا نہ دیکھ لیں۔ آنکھیں نہیں کھولتے۔ اور انسانوں کے بچے۔ لاحول ولاقوۃ۔ چاہے انہیں کوئی عمر بھر سونا نہ دکھائے۔ پیٹ سے آنکھیں کھول دیتے ہیں۔ ہنہ!"

مسعود سوچ ہی نہ سکی کہ وہ اسے بیوقوف بنا رہا تھا یا خود بن رہا تھا۔ کیونکہ اس نے سوچا۔ یہ ہی کندۂ ناتراش۔ عقل کا دشمن' بے تکے اشعار پڑھتا ہے۔ شاید سچ ہی کہہ رہا ہو۔! لیکن اسے اس بے چارے پر ترس آنے لگا! "اس کے محسوسات کتنے گندہ اور غیر تربیت یافتہ ہیں۔ ویسے یہ آدمی ہیرا ہے۔ کاش کسی نے اسے تراشنے اور جلا دینے کی کوشش کی ہوتی۔"

وہ ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ غریب۔ صرف جانوروں کی طرح چارہ کھا کر پہلوان ہوا جا رہا ہے۔ اور کسی کام کا نہیں۔ لباس تک سلیقہ سے پہننے کا ہوش نہیں۔ کاہی رنگ کے پتلون پر ڈھیلا ڈھالا کرتہ لاد رکھا ہے۔ بھلا یہ موسم کہیں ململ کے کرتے کا ہے؟"

اس نے ایک لمبی سانس کھینچی اور بولی "ہشام صاحب۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اندیشہ تھا کہ کہیں آپ برا نہ مانیں۔ ویسے آپ کہیں تو ـــــــ"
"برا ماننے کی بات ہوگی تو میں ضرور برا مانوں گا" اس نے صاف دلی سے کہا "مگر آپ فرمائیے۔ شائد آپ کی بات بری نہ لگے۔ ویسے آپ اس جبڑ پٹا بسام کا سلوک دیکھتی ہیں۔ اول نمبر کی شیطان کی خالہ ہے وہ۔ آخر کچھ تو برا ہوں میں اس سے۔ مگر نہیں۔ میرا مذاق اڑاتی ہے۔ مجھے جاہل بناتی ہے۔ خود جیسے بڑی میڈل پاس ہے۔ ایک دن میں اس کی بڑی پسلی ایک کر دوں گا انشاء اللہ"
گفتگو کا سرا مسحور کو مل گیا۔ بولی "یہ بار بار آپ ہر ایک کو مڈل پاس وڈل پاس کیوں کہا کرتے ہیں۔ بہت بڑا درجہ سمجھتے ہیں آپ مڈل کو؟ سنئے تو پھر۔ انورسیٹی کا سب سے بڑا درجہ کیا ہوتا ہے؟" آنکھیں پھیلا کر اس نے پوچھا۔ اور نہایت بھولپن سے مسحور کو دیکھنے لگا!"
انورسیٹی نہیں۔ یونیورسٹی۔ مسحور نے جواب دیا "وہاں کوئی ایک بڑا درجہ ہوتا ہے جو میں گنواؤں۔ درجنوں ہیں۔ بلکہ آپ آئندہ سے مڈل کا نام لینا چھوڑ دیجئے"
"زبان کی نوک پر بھی آئے تو گناہ گار۔ ہاں۔ آپ کیا کہنا چاہتی تھیں؟"
"میرے برا ماننے کی پروا کئے بغیر کہہ دیجئے!"
"سچ مچ؟"
"جی ہاں!"
"اچھا تو بیٹھ جائیے نا کہیں!"
ہشام حکم کی تعمیل میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ لیکن اخلاقاً مسحور سے اتنا بھی نہ کہا۔ وہ تو اس کے بھلے کے گنوار پن پر کڑھ کھا کر رہی جا رہی تھی۔

یہ کہہ کر وہ بھی ایک اسٹول پر ٹک گئی۔ اور دو منٹ کی خاموشی منانے کے بعد بولی: "یوں تو مجھے آپ سے کچھ کہنے کا حق نہیں ہے۔ مگر اتنا پوچھنے کی اجازت دیجئے کہ آپ نے آگے کے لئے اپنا نصب العین کیا بنا رکھا ہے؟"

"نصب العین؟۔ اس کا کیا مطلب ہے؟" ہشام نے پوچھا۔ سحر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

"مطلب یہ کہ ہر آدمی کا ایک مستقبل ہوتا ہے۔ آپ کا کیا ہے؟"

"اچھا۔ وہ" لاپرواہی سے ہنس کر وہ بولا: "میرا مستقبل تو بہت شاندار ہے۔ ابھی اس دن ممی کہہ رہی تھیں کہ میرے نام ایک مکان لکھ دیں گی۔ بھئی واہ۔ مزہ آگیا تھا۔ یعنی کہ مفت کا مکان۔ دوسرے لوگ کیا خاک چھانتے اور مٹی پھانکتے ہیں آپ کو معلوم ہے کہ ڈگری حاصل کرتے ہیں۔ روپیہ کمانے کے لئے۔ روپیہ جمع کرتے ہیں۔ مکان بنانے کے لئے۔ اسی میں نگوڑ ماروں کی آدھی عمر سرک جاتی ہے۔ مگر مجھے دیکھئے کہ اس قسم کا کوئی مار امار ی ہے ہی نہیں۔ مزے سے بنے بنائے مکان میں بیوی بچوں سمیت جا بیٹھوں گا۔ کرایہ دار کو بسا لوں گا۔ اور مرتے دم تک اطمینان سے کھاؤں پیوں گا!"

"اف فوہ۔" سحر نے تڑختا ہوا سر تھام لیا۔ "بخیر ہے بالکل! [illegible] کیا بگڑے گا؟"

"ہم۔ بیوی۔ بچے" وہ ڈری ہوئی آواز میں بولی: "پیسے کمائے بغیر کہاں سے آئیں گے بیوی بچے؟"

"یہ میں کیا جانوں" اس نے ہاتھ جھلائے اور بے ڈھنگے پن سے ہنسا: "یہ ذمہ داری تھوڑی ہے میری۔ ممی ڈیڈی جانیں! مجھے تو بس بیوی [illegible] بچے بے حد پسند ہیں۔ بھئی تو میں چاہتا ہوں کہ اپنی [illegible]

مگر وہ بھائی اتنے کنجوس مکھی چوس ہیں کہ اپنا ایک بچہ تک مجھے دینے کو تیار نہیں۔ دیکھا نہیں آپ نے اپنے ایک حقیر سے نوٹ کے لئے ابھی کیا بسور رہے تھے۔ ہنہ!"

مسحور دنگ تھی۔ تعجب ہو رہا تھا اسے۔ اتنا لمبا چوڑا آدمی ایسی باتیں کرنے لگے۔ اس کے ایک بھائی تھے۔ وہ اسی عمر کے تھے۔ لیکن تقریباً ڈاکٹری کورس کر چکے تھے اور نہایت سنجیدہ و متین آدمی تھے!"

دفعتہً وہاں سارہ آئی۔ کافی کی دو پیالیاں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ ہشام کو دیکھ کر اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے"

لیکن سارہ کو دیکھ کر جو موہوم سی مسکراہٹ ہشام کے لبوں پر آئی تھی۔ وہ مسحور کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی۔ پھر کسی نے اس کے دل میں چٹکی لے لی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ کیا بزرگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے؟ بھلا خالہ بی ایسے گنوار بے خوف سے اپنی لڑکی کا ہے کو بیاہنے لگیں۔ پھر یہ سوچ کر اس کا دل بھی بیٹھنے لگا۔ اس کی امی ایسے احمق سے اس کا بیاہ کیوں کرنے لگیں؟"

پھر اسے روایتی طور پر سارہ سے بے حد جلن لگی۔ حالانکہ اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ شاید مسحور کے دلی جذبات سے بھی قطعی لاعلم اور بے خبر تھی۔ قصوروار اگر تھا تو ہشام تھا۔ جس نے مسحور سی پرکشش لڑکی کو نظر انداز کر کے سارہ جیسی لڑاکا بد مزاج اور غصہ ور لڑکی کو اپنے خیالات کا مرکز بنا رکھا تھا۔ لیکن مسحور کو غصہ آیا سارہ پر۔ اور اس نے اپنے دل میں رشک کے شعلے بھڑکتے محسوس کئے!"

"میری کافی" ہشام غرایا "ادھر دو پیالی!"

"منہ دھو رکھئے" سارہ بھی گرجی "کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے۔ ابھی دو [illegible] کافی ٹھونس چکے ہیں۔ اب پھر رال ٹپک رہی ہے۔ یہیں پیتے تو پھوٹی آنکھ

دیکھ ہی نہیں سکتے!"

"کیوں پھوٹے گی میری آنکھ۔ کہنے والے کی پھوٹے!" ہشام بولا "آپ یہ لے لیجئے!" مسحور بولی:

"اب کیا لے لوں۔ منہ کا مزہ کڑوا کر دیا اس جنگلی بلّی نے" وہ بڑا سا منہ بنا کر بولا "میں پوچھتا ہوں، اس چھوکری میں آپ کی سی تمیز، تہذیب اور اخلاق آخر کیوں نہیں ہے؟"

"اپنی نکٹی صورت آئینے میں نہیں دیکھتے" سامرہ چیخے بغیر کیوں رہتی "نہ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل۔ خود تو تہذیب اور تمیز کا نام بھی نہیں جانتے۔ میرے نام دھرنے چلے ہیں۔ میں آپ سے لاکھ درجے اچھی ہوں۔ سنا!"

"منہ سنبھالتی ہے کہ میں درست کر دوں منہ اتنا" نہایت اُجڈ لہجے میں ہشام بولا۔

"ارے ارے!" مسحور بوکھلا گئی۔

"یہ لیجئے دو ہاتھ!" پیالی زمین پر ٹوٹ گری، سامرہ جھپٹی اور ہشام کے سینے پر دھڑا دھڑ دو گھونسے رسید بھی کر دیئے۔ ہشام نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔ مسحور کی آنکھیں حیرت و خوف سے پھٹ گئیں۔ سامرہ نے جھٹکا دے کر اپنے ہاتھ چھڑائے اور ہشام پاؤں پٹختا وہاں سے چلا گیا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" مسحور کی سانس پھولنے لگی۔

سامرہ ہانپتی ہوئی زبردستی مسکرائی "ایسے ہی ٹھیک رہتے ہیں ورنہ تو کھوپڑی پہ سوار ہو جائیں۔"

"تم واقعی ہوا نہیں سامرہ!"

"آج کوئی پہلی دفعہ مارا ہے!" سامرہ ہنس دی۔

کیا مطلب؟"

"ارے یہ جھگڑا تو چلتا ہی رہتا ہے" سائرہ پر کچھ اثر ہی نہ تھا مگر مسحور دنگ تھی۔ اس نے پہلی دفعہ یہ لڑائی دیکھی تھی۔ اور پریشان تھی اسے ہشام پر بے حد ترس آرہا تھا! بے چارہ۔ بزدل سے"

پھوپھی اماں اپنے پلنگ پر لیٹی تھیں۔ اور ہشام ان کے پیچھے بیٹھا ان کی کمر دبا رہا تھا"

"پھرتے پھرتے بدن تختہ ہو گیا ہے" وہ کراہیں "بیٹے دو ٹکیاں ایڑیوں پر بھی لگا دینا۔ اللہ تجھے سلامت رکھے۔ بڑی عمر کرے۔ صاحب نصیب ہو۔ دونوں جہان کی خوشیاں تجھے ملیں"

"پھوپھی اماں ـــــ!" وہ جھکی کمر دیدے نچا کر بولا"

"ہوں" وہ غنودگی میں بولیں"

"ایک بات بولوں!"

"ہوں۔ ہوں؟"

"ادھر دیکھئے میری طرف!"

"وہ ادھر مڑ کر اسے دیکھنے لگیں"

"خفا تو نہ ہوں گی آپ؟"

"کیا بات ہے؟"

"[illegible]" اس نے سر کھجاتے ہوئے [illegible]

[illegible]

"کیا بک رہا ہے!"

"جی ہاں۔ چھیڑ چھیڑ کر باتیں کرتی ہیں۔ میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہیں۔ ایک مرتبہ غریب خاکسار کے کمرے تک میں تشریف لے آئی تھیں اور رضائی کو الگ بٹھا کے میرا کمرہ تک صاف کر دیا تھا اس کا کیا مطلب ہوا ہے پھوپھی اماں!"

"ارے۔ ہوش میں رہو بچے" پھوپھی اٹھ کے بیٹھ گئیں اور تعجب سے اسے تکنے لگیں۔ اس کے چہرے پر دنیا بھر کی بے بسی اور بے چارگی طاری ہو کر رہ گئی تھی!

"پاگل بچی ہے۔ کچھ دنوں کے لئے آ گئی ہے۔ اس پر کوئی طوفان نہ اٹھا دینا۔ تم آج کل کے لڑکوں کے سے [illegible] سمجھدار نہیں ہو۔ تمہیں ذرا سی بات کا ادراک اور شعور نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں تمہاری وجہ سے کوئی بڑا جھگڑا کھڑا ہو کے رہ جائے۔ کیا تم [illegible] باتیں کرتے ہو؟"

"میں کیا باتیں کر رہا ہوں پھوپھی اماں" وہ [illegible] بولا "آپ نے مجھے کبھی دیکھا [illegible] آگے پیچھے پھرتا ہوں۔ وہی مجھ پر [illegible] لٹو ہوئی پھرتی ہیں۔ اب [illegible] بھاگ جاؤں۔ آپ ہی بتائیے کل کلاں کو کوئی بات ایسی ہو جائے کہ [illegible] ڈیڈی تک پہنچ جائے تو وہ میری کھال کیسے کھینچیں گے۔ ڈیڈی مجھے سڑک پر پھانسی دے دیں گے پھوپھی مجھے بچا لیجئے۔ اسی لئے میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا کہ کل کو خدانخواستہ کوئی گل کھلے تو آپ میرا بچاؤ کر سکیں!"

"بڑی آپا [illegible] [illegible] پھوپھی [illegible] [illegible] ان کا [illegible] [illegible] [illegible]

گی۔ میں پہلے ہی سے کیوں نہ کہہ دوں!"

"میرا نام لے کر کہیں گی آپ" وہ سہم سا گیا"

"نہ۔ تمہارا نام کیوں۔ یہ کہہ دوں گی۔ میں نے اس کی چلت پھرت سے اندازہ لگایا ہے"

"پھوپھی مگر اس لب و لہجہ میں نہیں کریں گے۔ آپ خدانخواستہ اس پہ کوئی الزام لگا رہی ہیں!۔ آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں پھوپھی!"

"میاں۔ وہ لڑکی ذات ہے۔ جیسی میری بچی ویسی وہ۔ اگر میں اپنی بچیوں کی کوئی ناگوار حرکت برداشت نہیں کر سکتی۔ تو اس کی بھی کوئی ایسی ویسی بات مجھ سے سہی نہ جائے گی۔۔ پہلے میں اندازہ تو کر لوں کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ صحیح بھی ہے کہ نہیں پھر کوئی بات کروں گی!"

"جی۔ جی۔ بس میں یہی چاہتا ہوں۔ پھوپھی۔ ان کی امی کب واپس آرہی ہیں؟"

"پوچھوں گی میں بڑی آپا سے!"

"لیکن جو کچھ کہئے۔ اس میں نہ مجھے سامنے نہ مسحور کو۔ ہاں۔ مگر میں ہمیشہ یہ سوچتا ہوں کہ یہ مسحور کیا نام ہے؟۔ مشہور ہوگا!"

پھوپھی جل گئیں۔ "پھر وہی جہالت۔ بدلیں نہ تم سے کیا کہوں اب۔ سبب معنی جانتے ہوتے تو بتاتی۔ مسحور اور مشہور میں فرق ہے!۔ کبھی لکھ کر سمجھاؤں گی"

"میں آپ کے پاس کس لئے بھاگ کے آیا ہوں۔ پتہ ہے؟"

"میں کیا جانوں؟"

مسحور بی رمضانی کو ساتھ لئے غریب کا کمرہ صاف کرنے پہنچ گئیں۔

آپ جا کے دیکھ لیجئے۔ میں نے ان سے کہا بھی کہ یہ عید پہ بیچ دیجئے تو کیا مستی۔ کیونکہ اگر
شاید آپ سے ملنے والے آئیں۔ کمرہ کباڑی کی دکان لگ رہا ہے۔ آپ باہر
جائیے۔ تاکہ میں صاف کر دوں۔ لہٰذا میں آپ کے پاس بھاگی آئی ہوں۔

"اوئی۔ یہ کیسا نخرہ ہے۔ لڑکی کوئی فساد کھڑا کر کے چھوڑے گی" پھوپھی اٹھیں
جوتی پہنی اور جھلاتی ہوئی چلی گئیں۔

پانچ منٹ انھوں نے دیکھا کہ خود ہشام کے کمرے ہی میں تھی کہ سر پہ رومال
لپیٹے جالے لے رہی تھی!۔ رمضانی فرش پہ گھٹنے ٹیکے بچھا قالین پر برش رگڑ رہا
تھا!

یہ خواہ مخواہ کی مہربانی پھوپھی کو ایک آنکھ اچھی نہ لگی!۔ اور لگو کی پرواہ
کئے بغیر وہ کمرے میں چلی گئیں۔ رمضانی رک گیا۔ مسعودہ نے گھبرا کر دوپٹہ کھینچ کر لیا۔

"پھوپھی اماں۔ گرد ہے!" مسعودہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"مگر تم سے کہا کس نے ہے بیٹی" پھوپھی کچھ خفگی سے بولیں "یہ سب تو ہمیشہ
رمضانی کرتا تھا۔ تم کیوں گرد میں اَٹ رہی ہو۔ باہر نکلو۔ پہلا دھوڑ
لڑکا اس کا کمرہ صاف کرے گا!"

"مگر پھوپھی ——" مسعودہ کا چہرہ اداس ہو گیا۔

"اچھی بات نہیں ہے۔ تم جانو بی بی۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ تم لاکھ اپنی
ہو۔ مگر تم ہشام کی کوئی نہیں ہو۔ سمجھیں۔ ایک لڑکی کے لئے یہ بڑی عیب کی بات
ہے۔! ہشام خود بھی بالکل لٹھ ہے۔ اسی نے کوئی نامناسب بات کہہ دی
تو دل پہ لکھ جائے گی۔ سارہ کو تم دیکھو۔ اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔ میں
نے کہنے سننے کے باوجود کبھی جھانک کر ادھر کا رخ نہیں کیا۔ بہت برا
لگتا ہے۔ چلو تم ادھر۔ تمھیں یہاں دیکھ کر تمہاری خالہ بی بڑبڑائیں گی!"

جھاڑو دو صفائی کرو ۔ اور تم باہر نکلو !"

ان کا لب و لہجہ اتنا سرد تھا کہ مسجود ٹھنڈی ہو گئی ۔ پھر اس نے کچھ نہیں کہا ۔ سر سے رومال کھول کر میز پر ڈالا ۔ دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا اور جھاڑو فرش پر ڈال کر پھپھی کے پیچھے چلی آئی !"

اسے شرمندگی کے ساتھ ساتھ اپنی توہین کا بھی احساس ہو رہا تھا ! لیکن کسی نے اس کے انداز سے کچھ بھانپ لیا تھا ؟ "کیا ہوا تھا ۔ پھپھی نے منہ یوں کر دیا !"

وہ اپنے کمرے میں آئی اور گم صم بستر پر آ بیٹھی ۔ دماغ میں طوفان سے سنسنا رہے تھے اور کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں !"

وہ بڑی حساس اور جذباتی تھی ۔ عمر بھر اس نے الٹے سیدھے ناطلی اور بے تعبیر خواب دیکھے تھے ۔ انہیں تعبیر طلب بنانے میں خون سکھا رہا تھا ۔ اور پہلی بار ایسے کسی شخص سے جذباتی دلچسپی ہوئی تھی ۔ لیکن اس کی دلچسپی کی انتہا نہیں ! وہ شخص جذباتی طور پر تو اس قسم ہی سے محروم تھا ۔ جذبات کے حوالے سے ؟ مسجود تو ابھی بچی تھی ۔ نہ وہ کسی کے پیار بھرے انداز کو دیکھ سکتا تھا نہ وہ آنکھوں میں لکھے ہوئے پیغام کو پڑھ سکتا تھا نہ [illegible] ابھی تک [illegible] سا تبسم بھی کسی بڑی خوشی کا پیش خیمہ بن سکتا ہے ۔ نہ اسے محبت بھرے بول متاثر کرتے تھے ۔ جو اس قسم ہی [illegible] تھی ۔ اور وہ خود کو اس نوبت پر دیکھ کر آپ ہی آپ خجل اور نادم [illegible] جا رہی تھی ۔ عجیب سا احساس ہو رہا تھا اسے ۔ خواب اور [illegible] ۔ جہاں وہ دم بخود کھڑی تھی !"

[illegible] آخری تازیانہ بھی رسید کر دیا ۔ [illegible] اسے بے چین کئے [illegible] روح فرسا خیال تھا ۔ آخر [illegible]

اُسے کمرے سے نکلتے اور سب کا سامنا کرتے اپنا منھ دکھاتے شرم آرہی تھی؛
ادھر چھوٹی بھی نے بیگم افتخار سے سب کچھ کہہ دیا۔

وہ متحیر بھی تھیں اور متاسف بھی۔ بولیں: "یہی فساد ہوتا ہے۔ جوانی تیز اور ماں باپ کی لاڈلی ہوتی ہیں۔ لو بھلا۔ ہشام کا سا جانگلو، کہاں اور مسحور کہاں۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ شوکت بھائی نے اپنے لوگوں میں اس کا کوئی رشتہ تلاش بھی کر رکھا ہے۔ ابھی تین چار مہینے پہلے میں بیٹی کی منہ دکھائی پر گئی تھی وہاں کچھ تذکرہ ہوا تو نعیمہ نے کہا تھا کہ شوکت بھائی نے اپنے بھتیجے کو پسند کر لیا تھا۔ مگر وہ ابھی برسرِروزگار نہیں ہوا۔ اس لئے رشتہ پکا نہ ہو سکا۔ اے اب نعیمہ خدا کرے کہ جلدی آئیں اور اپنی لڑکی کو لے جائیں۔ بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اسے تو کوئی کچھ نہ کہے گا مگر ہشام نشانۂ ملامت بن کر رہ جائے گا۔ ابصار کو دیکھتی ہو۔ جب تک آدمی بنے رہتے ہیں۔ خیریت رہتی ہے۔ اگر غصہ آجائے تو پھر ان کا سا جلوت بھی کوئی نہیں۔ لڑکے کو حلال کر کے پھینک دیں گے۔"

پھر نانی بوجی بے ساختہ بے خبری میں چھوٹی اور خالہ مسحور پر نظر رکھنے لگیں۔ ہشام کی نقل و حرکت کو معنی پہنانے کی کوشش کرنے لگیں۔ اس کی امی سے کسی نے کچھ نہ کہا۔ وہ بہت صاف گو تھیں۔ جھٹ سے راز الم نشرح ہو جاتا۔
انہیں مسحور کی پسندیدگی کا ثبوت بھی ایک روز مل گیا۔ کچھ دنوں کی گوشہ نشینی کے بعد مسحور پھر دل کے ہاتھوں ان سب میں گھلنے ملنے لگی۔ دوپہر کو کھانے کے بعد ہشام نے اٹھ کر فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور وہیں کھڑے کھڑے منھ سے لگا لی۔"

اس کی امی کو بڑا برا لگا۔ گرج کر بولیں: "یہ کیا کر رہا ہے گلاس کیوں نہ

نہیں پیتا! ۔ ہزار تمیز سکھائی کُندے کو۔ پر ویسا ہی رہا۔ ہائے اس کا ہو گا کیا ٹمی آپا ــــ!"

"ٹیبل پر تو رکھا ہے گلاس!" جھنجھلا کے ہشام بھی چیخا۔ دسترخوان پہ کوئی اور ایسے وقت ہشام کی حلق بھی کافی لاؤڈ اسپیکر ہو جاتی تھی! "کون سا اتنا گندہ ہے کہ آپ کی نحوست ماری بوتل غلیظ ہو جائے گی!"

"خاموش رہ بیٹا۔ کہے دیتی ہوں" بیگم افتخار بولیں "مجھے غصہ نہ دلا۔ بوٹی بوٹی الگ کر کے پھینک دوں گی!"

جھٹ مسحورا اٹھی گلاس لیا اور پاس جا کر ہشام کو دینے لگی۔ اس نے بڑی بے بسی سے ماں اور چچی کی طرف دیکھا۔ اور گلاس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ چنانچہ چچی یعنی بیگم افتخار جو سب کچھ جانتی بوجھتی تھیں اور در پردہ مسحور سے خفا بھی تھیں۔ ہشام کو ڈانٹ کر بولیں:

"ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے ہیں تیرے کم بخت۔ اسٹینڈ پر سے گلاس لے کر پانی کیوں نہیں پیتا؟" اور بی بی تم اِدھر آؤ۔ عادتیں خراب کر رہی ہو اس کی"

ہشام نے گلاس نہیں لیا۔ جان بوجھ کر نہیں لیا۔ بوتل میز پر پٹخی اور پانی پیئے بغیر پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ مسحور بے حد شرمندہ تھی!۔ اکیلے میں اسے ساحرہ نے آڑے ہاتھوں لیا"

"تمہارا انتخاب لاجواب ہے۔ مگر بی بی تم تو گھاٹ کے پتھر سے سر پھوڑ رہی ہو۔ خواہ مخواہ جی کو روگ نہ لگاؤ۔ کہیں کی نہ رہو گی۔ سُنا!"

"تم سے کیا چھپانا۔ ساحرہ۔ وہ مجھے شروع سے اچھے لگتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے اُن سے۔ میں ان سے کچھ توقعات وابستہ کرنے لگی ہوں۔ وہ۔ بہت معصوم ہیں۔ انہیں چاہنے ہی میں مجھے بے حد سکون ملتا ہے!"

سارہ نے اس کا مذاق اڑایا "مسحور بیگم ۔ تم تو یہاں رہ کر پڑھنے آئی تھیں ۔ تم نے دوسرا سبق لینا شروع کر دیا ۔ ارے ۔ کہاں تک اچھی صورتوں سے متاثر ہوا کرو گی ۔ دنیا میں اچھی صورتیں بے شمار ہیں ۔ اور تمہاری فقط دو عدد آنکھیں اور ایک عدد دل ناتواں ہے اس طرح ہر عمدہ شکل کو گھورتی اور اس پہ دل لنڈھاتی پھرو گی تو پھر تمہارے پاس تمہاری اپنی کیا چیز باقی بچے گی ؟ " پاگل نہ ہو جاؤ گی " مجھے دیکھو ...... میں تو بچپن سے ان کے ساتھ رہ رہی ہوں ۔ ہم میں پیار محبت مراد [illegible] تو نام بھی نہیں آیا ۔ بس ایک دوسرے سے مار کٹائی کرتے رہے ۔ وہ میرے بال کھینچتے تھے میں ان کے ہاتھوں میں کاٹتی تھی ۔ ارے ۔ میں تو اُن کی داہیات شکل پر نظر تک نہیں ڈالتی ۔ اگر ڈالتی بھی ہوں تو مجھے غصہ آجاتا ہے ۔ تمہیں وہ شکل معصوم اور پیار کے قابل کیسے لگتی ہے ۔ حیران ہوں "

" سارہ ۔ کہنا مت کسی سے "

" ہنہہ ! ۔ اجاڑ صورت ۔ یہ بات کسی سے کہنے کی بھی ہے "

" سارہ "

" ہوں ! "

سچ کہو ۔ کیا آج تک تمہیں کسی سے محبت نہیں ہوئی ! "

" بالکل نہیں ! "

اپنے لوگوں سے بھی نہیں ؟ " حیرت سے مسحور نے پوچھا "

ارے کیا اپنے لوگ " سارہ نے سخت منہ بنایا " یہ لوگ کوئی محبت و چاہت کے قابل بھی ہیں ۔ میں بتاؤں تمہیں ۔ یہ بھائی جان اور دولہا بھائی جو بڑے سنجیدہ و متین بنے پھرتے ہیں ۔ بچپن میں مجھے اس قدر ستاتے تھے کہ جس

کی حد نہیں۔ دولھا بھائی میری گڑیا اور گڈے کا نکاح پڑھانے آتے تھے اور مار کے چٹخارے بتاشے اور کھٹیاں کھا جاتے تھے۔ بھائی جان نے ایک دفعہ میری پکائی ہوئی پوری ہنڈکلھیا صاف کر کے رکھ دی تھی۔ ممی اور والد صاحب عمر بھر جھڑکیاں گھڑکیاں دیا کئے۔ انہیں مجھ سے تھوڑی محبت تھی۔ باجی سے تھی۔ اب بھی دیکھو نا باجی کی شادی کے بعد بھی انہی کا کلمہ پڑھے جاتے ہیں۔ پھر بھلا اتنی تلخ یادوں کے بعد میں کیسے کہہ سکتی ہوں کہ مجھے نگوڑی کسی سے محبت بھی ہے۔"

"اتنی لمبی تقریر تم نے فرما دی" مسعود مسکرا کر بولی: "مگر میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔۔۔!"

"تمہارا سوال ہی میری سمجھ میں نہ آیا ہو گا!"

"میں ان خون کی محبتوں کو نہیں پوچھ رہی تھی!"

"آپا۔ تو وہ والی محبت کے بارے میں پوچھا تھا تم نے" ساحرہ نے استہزائیہ پیرائے میں کہا: "سنو بی بی۔ میں ایسے پچھڑے دل کی نہیں ہوں۔ نہ اللہ کرے میرے خون میں کسی بیماری کے جراثیم ہوں کہ میں خواہ مخواہ کا روگ لگا کے دن کا چین رات کی نیند حرام کرتی پھروں۔۔۔" "مسعود۔ جب میں اس قسم کی محبت کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے خود سے شرم آتی ہے۔ کتنی بری بات ہے۔ ہمارا خیال کر کے کوئی آدمی کچھ سوچتا رہا کرے۔ ہم سے ملنے کے بہانے تلاش کرے۔ اور واہیات سی آرزوئیں ہم سے وابستہ کرے۔ چھی توبہ۔ مجھے اس قسم کی محبت نہ کسی لنگور سے ہوئی ہے اور نہ ہو گی۔ اور میری نصیحت تو یہ ہے کہ تم بھی ایسا بیکار خیال دماغ سے جھٹک دو۔۔۔۔۔۔ عمر کا بہترین حصہ ایسے بے سود جذبات میں برباد ہو جاتا ہے۔ جس کے بارے میں اگر دس سال بعد سوچو تو تعجب ہوتا ہے کہ ہم بھی کتنے احمق تھے!"

"کاش!۔ میرا دل و دماغ بھی تمہاری طرح میرے اختیار میں ہوتا۔"

"سچ سچ۔ تم ہشام بھائی سے محبت کرنے لگی ہو؟" سائرہ حیران تھی۔

"کہہ نہیں سکتی۔ بہرحال جب بھی ان کا خیال آتا ہے یا وہ سامنے آجاتے ہیں تو میرا دل دھڑک اٹھتا ہے۔"

سائرہ ہنس پڑی۔ "لو بھائی آج ہی پتہ چلا کہ بیکار چیز بھی کبھی نہ کبھی کارآمد ثابت ہو جاتی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ۔ وہ گوشت پوست کا بے حرف ابنارمل نہ پڑھے نہ لکھے۔ ان پڑھ۔ احمق۔ کس کام کے ہیں وہ۔ اپنی ہی جان اُن پر بھار رہے ہے۔ صبح سے شام تک ایک ایک کی ڈانٹ پھٹکار کھایا کرتے ہیں۔ بھلا ان سے وابستہ ہو کر کسی کا کیا بھلا ہو سکتا ہے؟"

مسحور کے دل پر بوجھ سا آ گرا۔ اب کون ہے رازدار۔ وہ آپی آپ پگھلتی گئی۔ ناممکن تھا کہ وہ ہشام تک اپنے دل کی آواز پہونچاتی۔ ایک حشر اٹھ جاتا۔ اب تو کالج جانے اور تعلیمی مصروفیات میں بھی اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ اس کے برعکس ایک سائرہ تھی۔ جیسے ہرے بھرے چمن کی مہکتی فضا میں اڑنے والی تتلی۔ اسے اس پر رشک ہوتا اور افسوس بھی ہوتا۔ دنیا کی سب سے زیادہ لذّت خیز جذبہ محبت سے وہ یکسر ناآشنا تھی!

اور ہشام تو جیسا کچھ تھا۔ ظاہر ہی تھا۔ مسحور چاہتی تھی کہ وہ بھی کچھ فکرمند، پریشان اور سوچتا ہوا دکھائی دے۔ کبھی اس کی طرف نگاہ اٹھے تو پلکوں پر نمی نظر آئے۔ کبھی وہ ٹھنڈی سانس بھرتا سنائی دے۔ لیکن اس کے مشاغل تو جیسے پہلے تھے ویسے ہی ہمیشہ رہے!"

گھر بھر میں دو کھلونے اسے پسند تھے۔ پھوپھا ابا اور ننھا منا ابی۔ دن بھر وہ ابرار سے کھیلا کرتا۔ اسے کھلاتا پلاتا اپنے ساتھ سیر کرانے لے جاتا اور اپنے ہی پاس سلا بھی لیتا۔ یا پھر پھوپھا ابا تھے۔ وہ بھی ذہنی طور پر بچے ہی تھے!۔ ہشام کو احساس تھا۔ وہ بے چارے دماغی طور پر معذور تھے۔ ان کے کوئی بھی بچہ نہ تھا۔ وہ ہمیشہ انہیں الجھائے رکھتا۔ ان کے لئے لائبریری سے کتابیں لاتا۔ اور اپنے ساتھ فلمیں دکھانے لے جاتا!۔ یا پھر یہ ہوتا کہ وہ شور مچانے کے باوجود دونوں قوالی گاتے۔ ایسے لاابالی اور جلد باز انسان سے کسی بھی جذبے کی پذیرائی کا خیال، خیال خام تھا۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ یا تو بیگم افتخار نے اپنی بہن کو خط لکھا یا پھر ان ہی کا کام جلدی سے نمٹ گیا۔ وہ ایک دن کسی قسم کی اطلاع کے بغیر آگئیں!۔

مسعود کو بھی اطلاع نہ تھی!۔ ان کے پاس تو مہینے بھر سے خط بھی نہ آیا تھا۔ لیکن ایک شام شوکت صاحب کا ملازم مسعود کو بلانے آپہنچا۔

"صاحب اور بیگم صاحبہ حیدرآباد آگئے ہیں۔ آپ کو واپس آنے کی تاکید کی ہے صاحبزادی!"

"کب آگئے پاپا" مسعود کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ بیگم افتخار نے غیر شعوری طور پر اطمینان کی سانس لی۔ مسعود ان کی بھانجی تھی۔ وہ متفکر تھیں۔ یہ جذباتی لڑکی کوئی گل نہ کھلا دے!۔ وہ خود اسے اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گئیں!"

مسعود نے ضد کی "مگر میرا دل یہیں زیادہ لگتا ہے۔ خالہ بی۔ صائمہ کے ساتھ میرا وقت بھی اچھا کٹتا ہے۔ آپ امی سے کہلوا دیجئے کہ امتحان کے بعد جاؤں گی!"

اچھا اچھا کہہ دوں گی مگر فی الحال چلو میرے ساتھ۔ میں خود بھی نیر سے ملنا چاہتی ہوں۔" وہ بولیں۔"

"تو آپ جا کے مل آئیے خالہ بی۔" اس نے جارحانہ انداز میں کہا۔

بیگم افتخار کو غصہ آیا۔ وہ لڑکیوں کی سرکشی کو کسی حال میں گوارہ نہ کر سکتی تھیں۔ مسحور کی دل شکنی کی پرواہ کئے بغیر بولیں۔"

"نہیں۔ میں اب تمہیں اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتی۔ چلو میرے ساتھ سامان بعد کو بھجوا دوں گی۔"!

مسحور کا دل کھٹ گیا۔ وہ اکیلے میں خوب روئی۔ اور پھر کچھ سوچ کر اٹھی۔ قلم کاغذ سنبھالا اور میز پر آ بیٹھی۔

وہ اتنی کھری تھی کہ مسحور کے اچانک چلے جانے سے بھی وہ خفا تو نہ ہوئی۔ اسے تو جانا ہی تھا۔ اگر مسحور نے رو رو کر آنکھیں سرخ کر لی تھیں تو وہ سرکا اچھی تھی۔ ویسے بیگم افتخار اور کچھ بھی اس کی بے موقعہ گریہ وزاری کی وجہ خوب جانتی تھیں!۔

اس دن وہ بطور احتجاج کالج بھی نہ گئی اور انتقاماً اپنا سامان درست کرتی رہی۔ سارہ نے بھی اس کی خاطر کالج کو چھوڑ دیا۔ اور مسحور کا ہاتھ بٹاتی رہی۔

سہ پہر کی چائے کے بعد بیگم افتخار نے موٹر رکشا منگوایا۔ اور سارہ سے بولیں۔ "چلو تم بھی۔ میرے ساتھ واپس آجانا!"

"اللہ امی۔ آج میں کالج نہیں گئی۔ مجھے عربی کے پورے پورے الفاظ کے معنی لکھنا ہیں ابھی!"

"سب لڑکیاں بے ڈھب کی ہیں۔" وہ بگڑ گئیں۔ "میری تو سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

آخر بچوں پر کیسی پھپھوندی جمی ہے کہ بڑوں کے حکم کو کچھ خاطر ہی میں نہیں لاتیں۔

انہیں سارہ پر بگڑتے چھوڑ کر مسحور نے غنیمت جانا اور بولی "اچھا میں ذرا پھوپھا جی سے مل آؤں" اور جواب سنے بغیر بھاگ کر صحن کی دیوار کے پیچھے چل دی۔ بیگم افتخار جزبز ہو گئیں۔

"کون سا ضروری تھا سیدہ میاں سے ملنا!"

پھوپھی کے صحن میں اونچے اوٹے پر پھوپھا اور ہشام بیٹھے تھے۔ ہشام تالیاں بجا رہا تھا اور دونوں مل کر ایکشن کے ساتھ قوالی گا رہے تھے ؎

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کئے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا۔

پہلے ٹکڑے پر پھوپھا نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا"

دوسرے پر منہ پر انگلی رکھ لی"

اور تیسرے پر یہ کیا کہ زبان نکال کر دکھا دی"

پھر ہشام کے ساتھ ہی زور زور سے ہنسنے لگے۔ دفعتاً ان کی نظر مسحور پر پڑی۔ انھوں نے مستفسرانہ نگاہوں سے ہشام کو دیکھا۔ اس نے چپکے سے کندھے اچکائے۔

وہ پاس آئی اور پھولی پھولی سانسوں کو قابو میں کر کے بولی۔

"پھوپھا ابا۔ میں جا رہی ہوں۔! آپ کے سلام کو حاضر ہوئی تھی"

وعلیکم السلام، وعلیکم السلام" بے حد خوش اخلاقی سے پھوپھا نے کہا۔ جانے اور اس کے سلام کو حاضر ہونے کا مقصد نہ پوچھا۔

پھر جیسے ہی پھوپھا اپنی ایڑی پر سے جوتی جھاڑنے اُدھر جھکے اسے کاغذ کی ایک گولی ہشام پر پھینک ماری اور بیگم افتخار کی آواز پر اُدھر بھاگ گئی۔

"میاں۔ یہ جوتی بعض دفعہ اپنا پورا سر کھال میں گھڑ دیتی ہے"

پھوپھا بولے۔ اور ایڑی کھرچتے ہوئے بولے "اُف۔ کیا بڑا اساد دھما پڑ گیا ہے"

ہشام کے دل میں چیونٹی نے سرگرا دیا تھا۔ اس نے بدحواس ہو کر ادھر اُدھر دیکھا۔ پھوپھی نے تو مسحور کی یہ حرکت نہیں دیکھ لی تھی۔ وہ تو ذبح کروا دیتیں۔! اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اس نے کاغذ کی گولی پتلون کی جیب میں رکھی اور بولا۔

" پھوپ۔ پھوپھا جی۔ میں غسلخانے جا کے ابھی آیا"

پھر غسلخانے کا دروازہ خوب مضبوط بند کر کے اس نے کپکپاتے ہوئے سرد ہاتھوں سے پرچہ کھول کر صاف کیا شکنیں درست کیں۔ اور تیزی سے پڑھا۔

" کاش۔ آپ اس قابل ہوتے کہ پڑھ لکھ سکتے۔ مجھے اس امر کا بے حد غم ہے کہ میں نہ تو اپنا مطلب واضح کر سکتی ہوں نہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔ پھر بھی امید ہے کہ یہ آسان سی تحریر پڑھ سکیں گے۔ اور پھر مطلب سمجھنا مشکل نہ ہو گا!۔ ہشام صاحب۔ آپ جیسے بھی ہیں۔ مجھے بے حد پسند ہیں۔ آپ کا یہی روپ یہی انداز مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں اتنے دن آپ کے ساتھ رہی اور کئی بار اپنے دل کی آواز آپ کو سنانا چاہی۔ مگر یا تو آپ نے سُنی نہیں یا ان سُنی کر دی۔ اب آپ سمجھ گئے کہ میرا مطلب کیا ہے۔ مجھے میرے والدین سے مانگ لیجئے۔ آپ کے سوا میں کسی اور کے ساتھ کہیں اور خوش نہ رہ سکوں گی۔ یاد رکھئے

آپ کی مسحور"

اس نے چٹھی پتلون کی اندرونی جیب میں ٹھونس لی اور چہرے سے ظاہر ہونے والی بوکھلاہٹ پر قابو حاصل کر کے باہر نکلا۔ اس کا دل خلق میں دھک دھک کر رہا تھا اور انگلیاں ابھی تک کانپ رہی تھیں!۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ ویسے وہ اس قسم کی ماڈرن محبت سے قطعی نا آشنا تھا۔ اس کی اٹھان ایک ایسے شریف خاندان میں اٹھی تھی جہاں اس قسم کی بدعتیں گناہ اور عیب کا درجہ رکھتی تھیں۔ نہ اس نے کہیں اور اس طرح کا ناٹک دیکھا تھا۔ اس کے گھر میں تو اس کے بھائی اور بہنوئی تک کبھی اپنی بیویوں سے بزرگوں کے سامنے باتیں نہیں کرتے تھے!۔ اور نہ اسکے باپ چچا وغیرہ اپنی بیویوں سے کوئی مذاق کی گفتگو کرتے تھے۔ وہ سب لوگ شرافت کے اعلیٰ معیار پر فائز تھے۔

ہشام کو سحور کی اس حرکت سے بہت افسوس ہوا۔ وہ شروع ہی سے [illegible] تھا کہ اس کے خمیر میں عشق کے چند جراثیم موجود ہیں۔ مگر وہ اسے [illegible] [illegible] کرنے کی کوشش کر رہی [illegible] یہ تو اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ [illegible] اس [illegible] سے کھیل رہا تھا۔ اس کی گفتگو اپنی جہالت کی ڈھال پر [illegible] تھا۔ اور سحور پر [illegible] واضح کر دیتا تھا کہ اس نے اس کی کوئی بات [illegible]۔ لیکن یہ خط۔ سحور کی یہ بے باکی؟ [illegible] اسے اتنی بُری لگی [illegible] وہ گم صم سا اپنے کمرے میں آیا اور خاموش سا کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے سوچا کہ اگر [illegible] اور قدم اٹھایا تو کیا ہوگا۔ اگر کوئی خط [illegible] سے بھجوا دیا۔ [illegible] پہلے خط کا جواب مانگا اور وہ خط [illegible] [illegible] سے کسی کے ہاتھ لگ [illegible] کیا ہوگا؟

[illegible] کرنا چاہئے۔ بھیجا [illegible] وہ کھا بھی ہے۔ اس سے کچھ کہا جانے [illegible]

برا مانیں گی۔ ممی بہت صاف گو ہیں۔ کوئی سی بات وہ خود تک نہیں رکھ سکتیں بیچاری۔ پھوپھی پہلے بھی رازدار تھیں اب بھی مدد کریں گی۔ وہ بیماروں کی طرح اٹھا اور پھوپھی کے گھر چلا گیا۔"

وہ اپنے صاف ستھرے کچن میں بیٹھی پھلکیاں پکا رہی تھیں اسٹیل کی چاندی سی لگن میں بیسن رکھا تھا۔ ایک چھلکدار کٹورے میں نئی املی کی چٹنی بھی تھی۔ پھوپھا جی اونچی چوکی پر بیٹھے ایک رکابی کا پیٹ بھرے پھلکیاں مار رہے تھے۔ اسے دیکھ کر نعرہ لگا دیا۔

"آؤ۔ آؤ۔ بیٹی تمہیں پکار رہی ڈالا تھا۔ بیٹھ جاؤ۔ اس موسم میں گرم پھلکیاں اور چٹنیاں لگا لگا کے نہ کھائیں تو زندگی میں گویا کچھ کیا ہی نہیں۔ بیٹھ جاؤ میرے پاس!"

"واہ پھوپھا ابا۔ یہ الگ الگ اچھا لگی۔ [illegible] تو آپ اکیلے سب کھا چکے [illegible]" وہ بولا اور زبردستی ہنس [illegible] کے پاس ٹک گیا۔

[illegible] نے تمہارے لئے چھپا رکھی تھیں۔ [illegible] انہوں نے [illegible] رکھی تھیں [illegible] کی [illegible]

[illegible] اسے [illegible]

[illegible] نے اپنے [illegible] لیا۔ پھر جب [illegible] آسودہ [illegible] کی زبانی [illegible] گئے [illegible] حادثے کا تذکرہ [illegible] بکھرا دیا۔

"میں تو پڑھ نہیں سکتا۔ کیا لکھا ہے۔ آپ ہی پڑھئے۔ مختصر سے کیا تحریر

فرمایا ہے۔"

پھوپھی نے محبت نامہ پڑھا اور سرخ ہو گئیں۔

"سچ سچ تجھ سے عبارت پڑھی نہ گئی!" انہوں نے پوچھا۔

"نہ۔!" بڑے معصوم بھولپن سے بیت اشام نے نفی میں سر ہلایا۔

"اس نے تجھ سے کبھی کچھ باتیں بھی کی تھیں؟"

"جی!"

"کیا کی تھیں؟"

"دریافت کیا تھا کہ آپ کا پسندیدہ پرندہ کون سا ہے۔ میں نے جواب دے دیا کہ۔ چیل۔"

"چیل دُور!" پھوپھی اماں نے کہا۔ پھر چولھا آف کر کے باہر نکلیں۔ وہ پیچھے لپکا۔ اور سہم کر بولا:

"آپ نے کیا سوچا ہے!"

"مجھے بدنامی سے بچانا ہے بیٹا۔ وہ لڑکی اگر ایسی ہی تیز ہے کہ چٹھیاں چپاٹیاں کرتی ہے تو سچ مچ کہیں اپنے گھر سے نہ لکھ جائے کوئی اور خط۔ بھائی صاحب یوں ہی تم سے ناراض رہتے ہیں۔ تب تو برداشت نہ کر سکیں گے۔ میں کسی طرح مسعود کی امی سے باتوں باتوں میں کہوں گی کہ اب لڑکی کو پڑھائی سے اٹھا کر کسی بھلے گھر میں بیاہ دیں۔ وہ بے چاری بہت سمجھدار ہیں۔ مان لیں گی میری بات۔ مگر سُن تو میاں۔ کیا وہ سچ مچ تجھے اچھی نہیں لگتی۔ اگر پسند ہو تو ہم بیاہ لائیں اسے؟"

"پھوپھی اماں۔ مجھ پر رحم کیجئے۔ میں یوں ہی بھلا!" وہ گڑگڑایا۔ "آپ اتنا نہیں سوچتیں کہ تعلیم یافتہ بیوی کے سامنے میں ہمیشہ احساسِ کمتری کا

مبتلا رہوں گا۔ مجھے شادی وادی کرنی نہیں ہے!"

وہ چلی گئیں

اور پھر وہ ایک روز میں گھر بھر میں ایک بڑا زبردست انقلاب آگیا۔!!!

سجد کو گھر پہونچا کے اور اپنی بہن سے مل ملا کے جب بیگم انتخار بعد مغرب پروگرام کے خلاف واپس آگئیں تو انہوں نے دیکھا کہ باہر مردانہ بیٹھک میں روشنی ہو رہی تھی اور ساجرہ کسی سے باتیں کر رہی تھی! ۔ پہلے تو انہیں خیال ہوا کہ شائد اشہر ہو یا منصور بنا ہوں ۔ لیکن یہ خلاف معمول بات تھی۔ منصور یا ایثار وغیرہ سے اس قسم کی توقع نہ کی جا سکتی تھی۔

تو پھر کون ہے۔ ایک نئی مردانہ آواز دفعتہً ان کے کانوں میں پڑی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر پردہ سرکایا۔!

ساجرہ گھبرا کر مڑی۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک لڑکا بھی کھڑا ہو گیا۔ زاہد لمبا تڑنگا لڑکا تھا۔ فیشن ایبل کپڑے پہنے۔ اس نے جھک کر انہیں سلام کیا۔

" کون ہو میاں تم۔ کیا چاہتے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

جی۔ میں محترمہ ساجرہ کی سہیلی کا بھائی ہوں۔ مجھے عبدالعزیز کہتے ہیں۔ چونکہ یہ آج کالج نہیں آئیں۔ ان کے پاس آپا کی ایک کاپی رہ گئی ہے۔ آپا نے مجھے لینے کو بھیجا تھا..... کل ان کا ٹسٹ ہے ۔ اسی لئے۔!"

" اچھا اچھا۔ تو لے لی کاپی"

جی ہاں "

"تو پھر۔!"

"جی ہاں۔ میں جا رہا ہوں۔! آداب عرض!" وہ جھکا اور مودبانہ سلام کر کے چلا گیا!"

سائرہ تھر تھر کانپ رہی تھی!۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اور بیگم افتخار کی نشتیں لفظ یا زہریلے تیر دندناتے ہوئے اس کے دماغ میں گھستے جا رہے تھے۔

"تم چلو اندر!" وہ سرد آواز میں بولیں۔ اور جب سائرہ اندر چلی گئی تب کچھ کہے بغیر وہ بھی اس کے پیچھے چلی گئیں!

سائرہ اپنے کمرے میں آ گئی اور مردے کی طرح سرد مسہری کے پائنتی بیٹھ گئی۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اور کچھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا ہو گا!۔ امی جان کی معنی خیز خاموشی اسے کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی!۔ اور وہ متوقع تھی کہ بہت شدید سرزنش کا مقابلہ اسے کرنا پڑے گا۔ لیکن اس نے دل مضبوط کر کے [illegible] وہ ماں سے مقابلہ کی ہمت [illegible]۔ وہ تو خود یہ سوال جواب [illegible] تھی۔ [illegible]

[illegible]

کاش وہ [illegible] سے [illegible] ہوتی۔ کاش جل جاتے اسے بڑھا دیا ہوتا۔ کاش ممی ہی اتنی جلدی نہ آ گئی ہوتیں۔

مگر اب سارے کاش بیکار تھے۔ جو ہونا تھا، وہ ہوا تھا۔ ممی اس

کا یہ قصور حشر تک معاف نہ کریں گی۔ خدا کی پناہ۔ سامرہ ؟۔ اور ایک لڑکے سے اکیلے میں باتیں کرے ؟۔ اُف فوہ ۔۔!

بُوا جی نے پردے سے کھچڑی سر نکالا اور بولیں: "بیٹا کھانا لگ گیا۔ جلد تمہاری امی بلا رہی ہیں" ایک بم سامرہ پر پھٹ پڑا۔ وہ مرے مرے قدموں سے طعام خانے میں پہنچی۔ حسبِ معمول سب ہی بیٹھے۔ سامرہ نے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہ کی تب اس کی جان میں جان آئی۔

ہشام نے ایک سرسری نظر اس پر ڈالی۔ مسکرایا اور بولا: "پھوپھی جی ذرا [illegible] مچھلی میری رکابی میں رکھ دیجئے!"

"مچھلی نہیں دلوائے" باجی ہنس دیں۔ "مچھلی کو سرکا دیجئے۔ یہ تو میں نہیں کھاؤں گا" وہ کہنے لگا "مچھلی مجھے بالکل [illegible] لگتا ہے"

"تو پھر کچھ اور لو۔ یہ دال کھاؤ!" پھوپھی نے [illegible] اس کے سامنے سرکا دی۔ "ہمیشہ کھانے کے وقت گڑبڑ کرتے ہو" ابا نے [illegible] ۔

سامرہ [illegible] نوالے اٹھا رہی تھی۔ جب تقریباً کھانا ختم ہو چکا۔ تو بیگم افتخار نے اپنے شوہر کو مخاطب کیا:

"ذرا میری ایک بات سنئے گا!"

"ہاں ہاں۔ بولو" بیگم افتخار نے تنبیہہ سے [illegible]

"بچے منع مت کرو۔ خدیجہ۔ یہ بہت ضروری [illegible]"

"کیا بات ہے" افتخار صاحب نے کہا؟

"سنئے۔ میں کل سے سامرہ کو کالج نہیں بھیجوں گی۔ بیگم [illegible] بہت پڑھ چکی ہے۔ اب آپ اس کے لئے [illegible] ۔ [illegible] اس کا بیاہ کر دینا چاہتی ہوں!"

سامرہ کے سر پر چھت گر پڑی۔ ہکا بکا سی وہ ماں کی شکل دیکھنے لگی۔
"کیوں کیوں ہے؟" افتخار صاحب بھی حیران دکھائی دئیے "اچھا خاصا پڑھ رہا ہے وہ۔ کم از کم بی۔ اے تو کر لے۔ پلک جھپکتے دو سال ختم ہو جائیں گے۔ اس عرصے میں اللہ نے چاہا تو عمدہ رشتہ بھی مل جائے گا۔ ابھی سے کیا جلدی ہے؟"
"میں کچھ سننا نہیں چاہتی" وہ نہایت مستحکم لہجے میں گویا آخری فیصلہ کرتی ہوئی بولیں "آپکو اسے بڑھا کرنا منظور ہے۔ کیجئے۔ بہر حال میں کل سے اسے پڑھنے نہیں بھیجوں گی! ابھی خدا کا احسان ہے کہ اس کے دیدوں کا پانی نہیں مرا ہے۔ مگر کل کلاں کی ذمہ داری کوئی نہیں لے سکتا۔ زمانہ بہت بے حیائی کا ہے۔ جو لڑکی کبھی کسی لڑکے سے بات نہ کرے۔ وہ بھی اس کے دو بول بیٹھ کر باتیں بگھار سکتی ہے۔ مجھے یہ پسند نہیں۔ آج سہیلی کے بھائی سے گفتگو فرمانے باہر پہونچی تھیں!"
"کیا۔ کیا۔؟" تقریباً چھ سات زبانوں سے نکلا"
سامرہ کا یہ حال تھا کہ جیسے بھرے بازار میں کسی نے اس کا لباس اُتار دیا ہو۔
وہ سوچ رہی تھی۔ کاش۔ یہ کرسی ہی اس کی قبر بن جاتی!"
"سہیلی کا بھائی؟" منصور نے پوچھا "کیا مطلب؟"
"مطلب اپنی بہن ہی سے پوچھو" بیگم غرائیں"
"سامرہ؟" منصور نے پکارا"
نجانے کتنی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ اس کا چہرہ سفید، ہاتھ پاؤں برف اور دل فریزر میں بنا ہوا تھا۔ کئی صدیوں کی کوششوں کے بعد وہ بمشکل بول سکی"

"نانی بوا نے ۔ مجھ سے کہا تھا ۔ کہ ۔ سہیلی کے پاس سے ۔ کاپی لینے لڑکا آیا ہے ۔ میں سمجھی ۔ سلمیٰ کا چھوٹا بھائی ۔ حمید ہو گا ۔ کئی بار ۔ آچکا تھا ۔ مگر وہ ۔ اس کے بڑے ۔ بجیبیر ۔ بھائی ۔ نکلے ۔ میں نے جان بوجھ کر ۔ کچھ نہیں کیا !" وہ اچانک رو پڑی ۔

جب تم نے دیکھا کہ وہ کم بخت بڑا بھائی تھا تو اسی وقت چلی آتیں اندر ۔"
بیگم نے کہا ۔" اس سے باتیں کرنے کیوں بیٹھ گئیں ۔ باقاعدہ ۔ کمرہ کھولا ۔ روشنی کی ۔ اسے اندر بلا کے بٹھایا ۔ نہیں ۔ ساجرہ تم جھوٹ بکتی ہو ۔ اسی لئے تم میرے کہنے پر اپنی خالہ کے یاں بھی نہیں گئیں ۔ تم لاکھ بہانے کرو ۔ مجھے تمہارا اعتبار نہیں ۔ اور آپ سب سنئے کہ یہ بات میں نے سب کے سامنے اسی لئے کہی ہے کہ اب سب جو کہتا رہیں ۔ مجھے اپنی لڑکی کی تذلیل منظور نہیں ۔ مگر وہ میری اکیلی نہیں ۔ سب کی ہے ۔ کوئی اس کا برا نہ چاہے گا ۔ لیکن اب کوئی مجھ سے یہ سفارش نہ کرے کہ میں اس کی تعلیم جاری رکھواؤں ۔ میں نے طے کر لیا ۔ اب وہ گھر بیٹھے گی اور رحیمن بوا سے سوزن کاری اور پکوان سیکھے گی ۔ جس گھر میں جائے گی وہ سب اس کا سلیقہ اور گھرداری دیکھیں گے ۔ یہ نہیں دیکھیں گے کہ بہو بیگم کون سی اعلیٰ ڈگری گلے میں لٹکا کے لائی ہیں ۔"

" ارے ارے ۔ بڑی آپا ۔" پھوپھا ابا نے دخل دیا ۔" آپ آج خلافِ معمول بہت خفا ہو گئی ہیں ۔ اب بس کیجئے ۔ دیکھئے وہ معصوم کس طرح رو رہی ہے ۔ معاف کر دیجئے ۔ اگر اس نے کوئی قصور کیا ہے ۔ بچے تو خطائیں کرتے ہی رہتے ہیں ۔ اب ہم تھوڑی بچوں کے ساتھ بچہ بنیں گے !"
معاف کر دیا میں نے اس کا قصور سید میاں ۔" بیگم نے جواب دیا ۔"

بس میرا جی چاہتا ہے کہ اسے پڑھنے سے اٹھا دوں۔ ماشاء اللہ اٹھارہ سال کی ہو چکی ہے۔ آگے پڑھانے کا میرا منشا نہیں ہے۔"

ساحرہ کی گریہ وزاری اور اس کے ہچکی آمیز بیان پر سب نے یقین کر لیا تھا۔ وہ ایسی لڑکی تھی بھی نہیں۔ لیکن بیگم کے سرد غصے کے سامنے سب چپ ہو گئے۔ حتیٰ کہ افتخار صاحب بھی خاموش ہی رہے۔ اور کسی نے بھی کچھ نہ کہا۔ ایثار، منصور یا افتخار صاحب تک نے نہیں کہا کہ اس کی تعلیم کا منقطع کرانا مناسب نہیں ہے۔ گویا کہ سب نے بیگم افتخار کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔

ایک ایک کر کے وہ سب خاموشی سے کمرے سے نکل کر چلے گئے۔ ساحرہ تو جیسے بت بنی رہ گئی تھی۔ وہ ممی کے پاس بیٹھ کر خوب زار و قطار رو دی۔ کمرے میں منصور، ایثار، ہما اور ہشام تھے۔ ساحرہ پر ہمدردی کی نگاہیں ڈال رہے تھے۔

ہما نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "میں کیا کروں ساحرہ۔ ممی میری ایک نہیں سنیں گی۔ ورنہ میں ان سے ضرور کہتی۔ اب تم بھی صبر کر جاؤ بی بی۔ ممی سے زیادہ کچھ کہنا انہیں زیادہ غصہ دلانا ہے۔ وہ مانیں گی تو بھی نہیں۔"

"اگر اپنی کلاس فیلو کے بھائی سے چند باتیں کر لیں تو ہوا کیا۔" ایثار احمد نے شاید اپنے میں بولے۔ "کون سی قیامت آگئی۔ ممی تو خواہ مخواہ رائی کا پہاڑ بنا رہی ہیں۔ اب بیچاری کی تعلیم غارت ہو گی۔"

"ممی کی یہی ڈکٹیٹر شپ مجھے بے حد ناگوار لگتی ہے۔" منصور نے کہا۔ "اب میں تم کو کیا بتاؤں یار۔ ایک مرتبہ میری کلاس فیلو۔ کیا نام فلورا ڈیوڈ مجھ سے ملنے گھر آگئی تھی۔ وہ بھی کچھ کتابوں ہی کا معاملہ تھا۔ اُف خوہ۔

اس کے جانے کے بعد جیسے کچھ [illegible] سے میرے ادھیڑے ہیں۔ خدا کی پناہ۔
ذلیل، کمینہ، آوارہ۔ لڑکیوں کا دیوانہ اور نجانے کیا کیا بنا یا تھا مجھے۔ خدا
کی قسم۔ میں تو رونے لگا تھا۔ تین دنوں تک مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ بڑی
مشکل سے [illegible] اور پاؤں پڑ کے تب [illegible] منایا تھا۔ مطلب یہ کہ۔ اب
[illegible] مشتعل ہو جاتی ہیں۔ کسی کی توہین [illegible]
[illegible]۔ اب [illegible] کالج [illegible] کی ہے۔ سامرہ [illegible]
کے آنسو [illegible] تو [illegible]۔ [illegible] بیٹھا ہے۔ آپ
[illegible] سے [illegible]

" [illegible] کہ جاتا ہوں۔ [illegible] مجھ سے جواب [illegible]
[illegible] محبت کرتی ہیں۔ [illegible] مگر [illegible]
[illegible] نہیں رکھتا۔ میں مجبور ہوں "

[illegible] اور [illegible] کی [illegible]
[illegible] قسمت [illegible] اب [illegible]۔ وہ [illegible]
[illegible] شمار [illegible] میں [illegible]

[illegible] کچھ دیر [illegible] بیٹھی رہی۔ پھر بہت دلاسے دے کر [illegible] اور
اپنا [illegible]۔ ماہرہ نے بھی [illegible] دیا۔ شادی کا غصہ [illegible]
ٹھنڈا ہو جائے تو اپنا غصہ واپس لے لیں۔ مگر اس کی امید کم ہی تھی!
شام تک بڑی [illegible] آئیں پھر تا ہوا [illegible] گیا۔
جب [illegible] گیارہ بارہ بجے تک سب اپنی اپنی [illegible] میں چلی گئے۔
گھر پہ سناٹا طاری ہو گیا۔
اور پھر [illegible] موسم تبدیل ہونے لگا۔ تیز ہوائیں درختوں کو جھنجھوڑنے [illegible]

ہوئی چلنے لگیں۔ پانی کی بوچھار اس طرح ٹین کے سائبان پر پڑ رہی تھی جیسے اولے گمر رہے ہوں۔ پھر ہوا کے ایک طوفانی جھکڑ کے ساتھ بارش شروع ہوگئی۔

سائرہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ رات کی رات میں ایسا تکلیف دہ انقلاب اس کی زندگی میں آگیا تھا کہ اس کا تجزیہ کرنے سے وہ قاصر تھی۔! اس پر ایک ناپاک بہتان لگا۔ اس کی اچھی بھلی تعلیم کا ناس ہوگیا۔ اور مزہ یہ کہ کوئی اس کی طرف سے بدلنے والا نہ تھا۔ رہ رہ کر اس پر غصہ آندھی طوفان کی طرح چڑھ آتا۔ وہ عجیب عجیب خوفناک منصوبے بناتی۔ پھانسی دے لے خود کو۔ ممی کو اس طرح سزا دی جا سکتی ہے۔ سہ منزلے سے نیچے سڑک پر کود جائے۔ چوڑیاں پیس کر پی لے۔ مگر نہیں۔ پھانسی کا پھندا اگر کس کے نہ لگ سکا۔ سڑک پر کودنے سے بچ گئی ہڈی پسلی چٹخ گئی یا چوڑیوں کی کانچ سے آنتیں کٹ گئیں تو پھر۔؟

پھر! یہ کہ ایسا نہ ہو کہ کہیں سب کے نظریے بدل جائیں۔ غلط قسم کی لڑکی تھی۔ جانے کیا کھیلا کیا تھا کہ خودکشی کر لی۔

اونھ۔ سب واہیات۔ سب بکواس۔ وہی ہوگا جو ممی کو منظور ہوگا۔

غصے کی بھٹی اس کے اندر سلگ اٹھی۔

اپنے دماغ کو سکون پہونچانے وہ برآمدے میں نکلی۔ یہاں سے وہاں تک طویل برآمدہ مدھم سے بلب کی ٹمٹماتی روشنی میں سنسان اور بھیانک سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے آسمان پر نظر کی۔ اور کلیجہ کپکپا گیا۔ کتنا ہولناک ہو رہا تھا آسمان۔ گھٹا ٹوپ کالے کالے بادلوں سے چھپا ہوا۔ باغ کے اونچے درخت بے چارے ارضی و سماوی آفات جھیلنے اور برہم و خشمناک عناصر قدرت کا مقابلہ کر کے بار بار شکست خوردہ انداز میں زمین کا منہ دیکھ

رہے تھے "

یک بیک پانی کا ایک بلبلہ سا اس کے چہرے پر لگ کے پھٹ گیا۔ اسکے لبوں سے ننھی سی چیخ نکلی "

" کون ہے " سارہ نے ہشام کی آواز سنی۔ تن بدن سلگ اٹھا۔ یہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ سو کیوں نہ گیا۔ کیا اب یہ بھی جان جلائے گا؟ "

سارہ شدید غصّے کے مارے چپ کھڑی رہی۔ حتیٰ کہ وہ خود پاس آیا اور سارہ پہ نظر پڑی تھی کہ اچھل پڑا۔

" تم ہو! " وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بولا " ہائے اللہ۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ ایک رات یہیں میں بھوت کے سائے سے ڈر چکا ہوں! "

آپ خود ایک بھوت ہیں " سارہ ضبط نہ کر سکی " جائیے یہاں سے۔ میں اکیلے میں کچھ سوچنا چاہتی ہوں! "

" ایک سے دو بھلے۔ کیا سوچنا چاہتی ہو مجھے بتاؤ۔ تاکہ میں بھی تمہارے ساتھ سوچوں! "

اب کیا آپ کلیجہ سلگانے گے " وہ گلوگیر لہجے میں بولی " میں اپنی قسمت پہ رو دوں گی۔ کل تک سب کی من چاہی تھی۔ آج من اتری ہو گئی ہوں۔ اللہ میاں نے یہ کیا حرکت کی میرے ساتھ " وہ رو پڑی۔

ارے ارے " ہشام نے بصد مشکل اپنی ہنسی ضبط کی اور بولا " تم کسی طرح من اتری نہیں ہوئی ہو بھئی۔ آگے نہ پڑھنا کوئی ایسی قیامت خیز بات نہیں ہے۔ ہاں یہ البتہ تم پہ ظلم ہوا کہ تم کالج کی سہیلیوں سے مل کر گپیں ہانکنے، نئے نئے فیشن سیکھنے اور فلم کی اسٹوریاں سننے سے قطعی محروم ہو گئیں اور کچھ نہیں ہوا "

"آپ کو علم کی کیا قدر۔" جل کر سارہ نے کہا۔ "جیسے آپ اپنے لفنگے دوستوں میں گھل مل کر بیہودہ فلموں کی اسٹوریاں سنتے ہیں۔ ویسا ہی آپ دوسروں کو بھی سمجھتے ہیں۔ سہیلیوں پر مٹی پڑے۔ انہی کی بدولت یہ دن دیکھنا پڑا۔ مجھے تو فقط بی۔ اے نہ کرنے کا غم ہے۔ ہائے کیا ارمان تھا۔ میرے نام کے ساتھ سارہ افتخار بی۔ اے لکھا جائے گا۔ مگر اب کیا خاک پتھر لکھنے کو ہے!"

"ارے کاہے کا غم یار۔ گولی مارو۔" ہشام نے بڑی بشاشت سے کہا۔ "تم ٹسوے بہاتی ہو۔ مجھے ہنسی آتی ہے۔ بھلا پڑھائی لکھائی بھی کوئی چیز ہے نامُراد۔ مجھے دیکھو۔ ایسا کوئی روگ ہی نہیں پالا میں نے۔ تبھی تو مزے میں ہوں۔ ڈٹ کر گھی، دودھ، ملائی اور انڈے کھاتا ہوں۔ پہلوان بن رہا ہوں۔ تم بھی ایسا ہی کرو۔ مگر تم کیا کر سکو گی۔ چچی اماں نے تو حکمِ فاسق دے دیا ہے کہ!!"

"حکمِ ناطق!" دانت پیس کر سارہ نے تصحیح کی۔

"وہی سہی۔ جو تم کہو وہی درست ہے۔" ہشام نے کہا۔ "میں کہہ رہا تھا کہ چچی اماں نے کہہ دیا ہے کہ تمہارا بیاہ کر دیں گی۔ ہاہ۔ ہاہ۔ دل پر ایسا گھونسہ لگا ہے کہ بس کہہ نہیں سکتا۔ کیا سوچا تھا۔ کیا ہو گیا۔ ارے خدایا۔"

اس نے ایک دلدوز آہ بھری اور شعر عرض کیا ؎

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

"سچ کہتی ہوں ہشام بھائی۔ میں آپ کو مار دوں گی۔ میرا دل دماغ قابو میں نہیں ہے۔ آپ کیا بکواس کر رہے ہیں۔ میری حالت پر آپکو ہنسی آ رہی ہے۔

آپ جاہل مطلق اَن پڑھ ہیں۔ آپ کو علم کی کیا قدر۔ کچھ پڑھے لکھے ہوتے تو میرے دل کی حالت کا اندازہ ہوتا۔ آپ یہاں سے چھوٹیے اور مجھے اکیلے میں سوچنے دیجیے۔ وہ جلی بھنی سی بولتی چلی گئی۔

پتہ نہیں۔ تم کو جی اماں کہاں جھونک دیں" ہشام نے کہا۔ مگر سارہ۔ سچ کہو۔ کیا۔ تمہیں۔ مجھ سے۔ مطلب یہ کہ۔ میں تمہیں بالکل اچھا نہیں لگتا؟" ہنسی سے لرزتی آواز کو اس نے کھانسی میں چھپا لیا۔

سارہ اُسے خونخوار شیرنی کی طرح گھورنے لگی" آپ اچھے لگیں گے مجھے؟" کبھی آئینے میں اپنی چیچک کھدی شکل بھی دیکھی ہے؟"

خیر جی۔ شکل کو مارو گولی" وہ کھانس کر بولا" تم تو میری سنہری سیرت کو دیکھو۔ تمہارا ابن عم ہوں۔ نیک ہوں۔ صاحب جائیداد ہوں۔ تم سے کم پڑھا لکھا ہوں۔ ہمیشہ تمہارا فرماں بردار بنا رہوں گا!"

" ہشام بھائی" وہ تلملا کر چیخی" کیا آپ میرا مذاق اڑانا چاہتے ہیں!"

اس میں مذاق کی بات کون سی ہے" ہشام نے جواب دیا" آخر تمہاری شادی ہو گی ہی۔ کسی غیر آدمی سے تو میں لاکھ درجے اچھا ہوں۔ صرف ایک پڑھائی کی طرف سے مارا گیا ہوں تو کیا۔ نیک بیوی۔ اپنے میاں کا ہر عیب چھپا لیتی ہے!"

دھڑاک سے اس کے نازک نازک گھونسے ہشام کے سینے پر پڑے۔ وہ دو تین قدم پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ سارہ پھر جھپٹی۔ مارے غصے کے اب آدھوت بن گئی تھی۔ ہشام نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔ مگر آپے سے باہر ہو کر سارہ نے ہاتھ چھڑائے اور ریحین نانی سے سینے ہوئے کوسنے دینے لگی!۔ اور جب وہ غصے کی بےبسی میں یکبارگی رونے لگی

تب ہشام بھاگ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔"

جیسے کہ ماہرہ کا خیال تھا۔ بیگم افتخار کا اشتعال کبھی نہ کبھی سرد پڑ جائے گا سو ایسا نہ ہوا۔ وہ اپنے آخری اور قطعی فیصلے پر اٹل رہیں۔ ان میں اور دوسروں میں جانے کیا کیا باتیں ہوئی تھیں کہ بیچ بیچ سائرہ کے لئے ایک پیغام آ گیا۔ منصور کے وائس چانسلر صاحب نے بھجوایا تھا۔

بیگم افتخار پھولی نہ سمائیں "یہلا مول سونے کا تول۔ اگر منصور کے چانسلر صاحب نے بھجوایا ہے تو پھر تحقیق وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ آنکھ بند کر کے قبول کر لو۔"

منصور حیران تھے "مگر انہیں پتہ کیسے چلا۔ میں تو یونیورسٹی کو خیرباد کہنے کے بعد سے آج تک دوبارہ ان سے ملا ہی نہیں ہوں!"

"میں نے بھی اس قسم کا کوئی تذکرہ نہیں کیا!" ایثار احمد بھی متعجب تھے۔

"کچھ بھی ہو۔ انہیں الہام ہوا ہو گا!" بیگم نے کہا "اب میں اس رشتے کو چھوڑنے والی نہیں" انہوں نے شوہر کو متوجہ کیا "آپ سنتے ہیں اُن سے جا کر ملئے یا انہیں اپنے ہاں دعوت دیجئے۔ پھر میں ان سے خود بات کروں گی!"

"میں بے چاروں کو جانتا پہچانتا تو ہوں نہیں" افتخار صاحب بولے "یہی حال ان کا بھی ہے۔ دعوت دینے کا کوئی تک بھی ہو آخر"

"منصور بلا لائیں گے" وہ بولیں۔

"مگر ممی پہلے معلوم تو ہو کہ آخر ان کی طرف سے جو پیغام آیا ہے۔ وہ آخر ہے کیسا۔ اور آخر ———!"

"آخر آخر کیا کر رہے ہو!" ممی جھلائیں "یہیں بیٹھے بیٹھے تو سب کچھ پتہ چلے گا نہیں۔ تم جاؤ اِن سے ملو اور انہیں صاف صاف دعوت دو۔

پھر سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ ان سے تم سب مل کے پوچھنا کہ آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ہم ایک رشتے کی تلاش میں ہیں !"

پھوپھا ابّا جو وہیں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ بول اُٹھے " بھائی مجھے اب یاد آیا۔ یونیورسٹی کے صدر صاحب سے۔ مطلب یہ کہ چانسلر صاحب سے میں نے اس بارے میں گفت و شنید کی تھی "

تم نے۔؟" کئی زبانوں سے بے اختیار نکلا۔ ناممکن سی بات تھی۔ بھلا پھوپھا ابّا جیسے بھلکڑ نے رشتے ناطے کی بات کہاں یاد رکھی ہو گی۔ چنانچہ پھوپھی نے مشکوک انداز میں استفسار کیا۔ پھوپھا کچھ سوچنے لگے پھر بولے :

" یہ یاد نہیں آ رہا ہے کہ کس نے۔ توجہ دلائی۔ اور کس نے ان محترم سے ملایا تھا مجھے۔ ہاں۔ وہ کسی صاحب کا دیوان خانہ تھا۔ جہاں ہم سب بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ تبھی میں نے صدر صاحب سے تذکرہ کیا تھا۔ وہ جھٹ سے بول اٹھے تھے کہ۔ ایک رشتہ تو ہے میرے اپنے طالب علم کا۔ میں نے گذارش کی کہ جناب پھر بھجوائیے۔ چنانچہ انہوں نے بھجوا دیا۔ اچھا ہاں۔ لڑکے کا نام نسب نامہ کچھ بھجوایا ہے کہ نہیں ؟"

کہاں ؟" پھوپھی نے کہا " صرف بھائی صاحب کے نام اس مضمون کا رقعہ آیا ہے کہ ایک پیغام کی نشان دہی کر سکتا ہوں۔ تفصیل سے آگاہ فرمائیے کہ کس قسم کا لڑکا مطلوب ہے ؟"

کیا ؟۔ لاحول ولا قوۃ۔" انصار صاحب بولے " اماں کس قسم کا کیا ؟ ہم لڑکے کے سر پر سینگ بھی چاہتے ہیں گویا !"

" مطلب یہ کہ بھئی ذات پات۔ تعلیم۔ خاندان، ملازمت۔ ارے کوئی ایک چیز ہوتی ہے دیکھنے دکھانے کی !" افتخار صاحب نے کہا "

آج کل تو حال یہ ہے کہ اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے کے لڑکے زیادہ کمائی کی ہوس میں باہر بھاگے جا رہے ہیں۔ ان کا مطلب استفسار سے یہ ہو گا کہ باہر کا لڑکا تو نہیں چاہیئے۔ لاکھوں طالب علم ہوں گے ان کے۔ اچھا تو میں ان کے خط کا کیا جواب دوں؟۔ وہ یقیناً جواب کے منتظر ہوں گے۔ مگر بھئی سیدیاں تم نے یہ کام کیا خوب!"

"جواب یہ دیجئے کہ منصور کے ہاتھ کہلا بھیجئے کہ آج فلاں وقت یا کل پرسوں جناب غریب خانے پر تشریف لا کر چائے نوش فرمائیں!" پھوپھی بولیں۔

"چائے۔ ارے آج ابھی تک چائے نہیں بنی" پھوپھا چونکے "یہی تو میں سوچ رہا تھا کہ صبح سے سر میں درد کیوں ہو رہا ہے۔ بھئی چائے بنواؤ"

آپ پی چکے ہیں۔ اب کھانے کے بعد ملے گی" پھوپھی بولیں ہو گئیں

اور سلیمہ۔ بھئی غرض اپنی ہے بیٹی!" انتخار صاحب نے کہا "میں انہیں اپنے گھر پر زحمت نہیں دے سکتا۔ فی الحال تو خط لکھ کر اور ان کا بہت بہت شکریہ ادا کر کے لڑکے کا نسب نامہ منگواتا ہوں کیا خیال ہے؟"

اچھا یہی سہی۔ پھر ابھی اتوار کو اللہ رکھے ماہرہ کے چلّے کا نہان ہے۔ اسی سلسلے میں ان کی دعوت بھی کر دیں گے" بیگم نے کہا۔

اللہ ممی۔ ہائے" ماہرہ نے دل تھام لیا "انہیں پتہ نہ چلے کہ یہ میرے چلّے کی دعوت ہے۔ توبہ!"

نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں کہیں گے" منصور نے کہا"

ان سب میں اس قسم کی کانفرنس عموماً رات کے کھانے پر ہوا کرتی تھی۔ اب بھی طعام خانے ہی میں باتیں ہو رہی تھیں!" ساجرہ یہاں موجود نہ تھی۔ اس نے اپنے کمرے سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔! رات کے ساڑھے نو بجے

چکے تھے!" دفعتہً ابصار صاحب نے کہا "ہشام صاحب آج پھر غائب ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ڈانٹ پھٹکار کا اثر جاتا رہا۔ اب ایک مرتبہ پھر ڈوز پلانا چاہیے مجھے تو آپ مزید کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ والدہ محترمہ نے شہہ دے دے کر گدھے کو شیر بنا دیا ہے۔ حد ہے کہ بھائی صاحب کی نصیحت بھی صاحبزادے پونچھ کے پھینک دیتے ہیں۔ میرا کیا ہے۔ خود پچھتائیں گے۔ اماں جان سر پکڑ کر رو دیں گی۔ میں کہتا ہوں۔ اس نکھٹو کی مصروفیات کیا ہیں۔ آدھی آدھی رات تک دوستوں میں کیوں دفن رہتا ہے؟"

"آج تو بھیا ڈھائی بجے ہی سے گھر میں نہیں ہیں" صدف بولی "میٹنی شو پھر فرسٹ شو ملاحظہ فرما کے اطمینان سے آئیں گے!" افتخار صاحب نے کہا "حالانکہ میں نے بیوقوف سے کہہ دیا تھا کہ اس طرح گھر سے باہر رہو گے تو ٹخنے اتار دوں گا!"

"ایک دفعہ اتار ہی دیجئے بھائی صاحب" بیگم ابصار زچ ہو کر بولیں "کم از کم ایک جگہ ٹک کے تو بیٹھے۔ ناہنجار۔ جلے پاؤں کی بلی کی طرح مارا مارا پھرتا ہے۔ نگوڑے کے دوست ہی کون سے ہیں۔ ایک تو وہ موچی ہے۔ اس سے بہت گاڑھی چھنتی ہے۔ دوسرا یہ موا گردھاری مغفانی۔ ساتھ ساتھ سینما جاتے ہیں"

"اچھا میں منع کر دوں گا!" افتخار صاحب نے کہا۔

ان سب کے یوں ادھر ہونے کے بعد بے چاری بیگم ابصار چپکے سے آ کر صدر دروازے میں کھڑی ہو گئیں۔ ماں کا دل تھا۔ ڈر رہی تھیں کہ ہشام کے آنے کے ساتھ ہی کہیں افتخار صاحب تپے بیٹھے گھر نہ پل پڑیں۔ وہاں انہوں نے اچانک ہشام کو دیکھا کہ چپراسی کے اسٹول پر بیٹھا پڑھ رہا تھا۔

میاں اس جگہ بیٹھ کر پڑھ رہے ہو!" وہ حیران ہوئیں۔

جی" وہ مدھم لہجے میں بولا۔ "شاہی بھیا کا انتظار کر رہا ہوں آئیں گے تو جھٹ آگاہ کر دوں گا کہ ان کی شامت نے آواز دی ہے کہیں چھپ جائیں۔ مگر میں پوچھتا ہوں چھوٹی چچی یہ آخر اتنی اتنی رات تک باہر کیا کیا کرتے ہیں!؟"

وہ اس کی محبت پر نثار گئیں۔ اور اسی جوش میں پچاس گالیاں بیٹے کو عطا کر دیں"

آپ جائیے آرام کیجئے۔ میں یہاں بیٹھا ہوں۔ انہی کو خبردار کرنے کے لئے آپ یہاں آئی ہیں شائد!"

اور کیا۔ نامراد نے ایک دن "ان" کے جوتے کھائے تھے۔ چار دن بستر سے ہل نہ سکا تھا۔ مگر سب کچھ بھول جاتا ہے۔ آج سختی سے پوچھوں گی۔ تھا کہاں!؟"

وہ اُدھر گئیں۔ اور پانچ ہی منٹ بعد ہشام نے دروازے میں قدم رکھے۔!

شاہی بھائی۔ الشہر نے سرگوشی کی: "ڈیڈی ہنٹر لئے آپ کے منتظر بیٹھے ہیں۔ جلدی سے جا کے چھپ جائیے کہیں"

"اوہ" اس کے منہ سے سیٹی کی آواز نکلی۔ ایک منٹ الشہر کے منہ کو تکتا رہا پھر جھک کر جوتے اتارے۔ اور پنجوں کے بل اندھیرے میں بھاگتا منصور کے کمرے تک آیا۔ ابھی وہ لوگ سوئے نہ تھے۔ دروازہ کھلا تھا۔ پردہ ہوا اُن سے جھوم رہا تھا اور روشنی باہر آ رہی تھی۔

اسے توپ کے گولے کی طرح اندر آتے دیکھکر منصور اور ریحہ دونوں اچھل

پڑے۔

"یا وحشت" نجمہ نے ڈانٹ دیا "اس طرح آتے ہیں کیا۔ ابھی پردے سے اٹک کر منہ کے بل آ رہتے زمین پر۔ شاہی! یہ تم نے اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے۔ اس وقت آ رہے ہو باہر سے" منصور گرجے "

خدا کے لئے بچا لیجئے" وہ گڑگڑایا "آج میرے شاہی کباب بن جائیں گے۔ چچا ابا ہنٹر لئے میرے منتظر بیٹھے ہیں۔ لوگ کسی کے لئے پھولوں کا ہار۔ پھولوں کا گلدستہ تیار رکھتے ہیں۔ یہاں ہنٹر۔ ہونہہ!"

"میں خود جا کے ڈیڈی کو اطلاع دیتا ہوں تم ساڑھے دس بجے رات کو آوارہ گردی کر کے آئے ہو اور میرے کمرے میں چھپے ہو" منصور نے اٹھتے ہوئے کہا "پھر وہ خود تم سے پوچھ لیں گے۔ تم کہاں تھے اب تک؟"

"ہائے ہائے۔ آپ کے پاؤں پڑتا ہوں بھائی جان" وہ بلبلایا

"سنی تم نے اس کی ہائے ہائے؟" وہ نجمہ سے بولے۔ اور اٹھنے لگے۔

"اللہ جانے بھی دیجئے!" نجمہ نے کہا۔ پھر اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کی کھوپڑی کو جھٹکے دیتی ہوئی بولیں "دل چاہتا ہے میں بھی حلال کر کے پھینک دوں۔ نجانے کیسا بے غیرت ہے۔ سب کے جوتے کھاتا ہے اور اپنی مرضی کر کے رہتا ہے۔ آوارہ ذلیل بدمعاش۔ کچھ کھایا ہے کہ دوڑ رہے ہیں پیٹ میں چوہے؟"

وہ سی سی اور اُف اُف کرتا بال سلجھاتا مسہری پر ٹک گیا اور دردناک آواز میں بولا "

"چوہوں کے پیچھے بلیاں بھی بھابی جی"

"جاؤ اپنے کمرے میں۔ نگلنے کے لئے کچھ لے آؤں!" وہ اٹھیں۔

خدا کے لئے۔ اس وقت باہر مت ہنکائیے مجھے۔" ہشام پھر گڑگڑایا "چچا ابا بس آپ ہی کے کمرے میں نہیں آئیں گے۔ اتنا مجھے یقین ہے۔"

نجمہ بُرا سا منھ بنا کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ ہاتھ جوڑ کر منصور کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ اسے قہر آلود نظروں سے گھور رہے تھے۔

"بھائی جان۔ جان کی امان چاہتا ہوں۔ آج سالے تین چار دوست میٹنگ اور MATINEE فرسٹ شو میں گھسیٹ لے گئے۔ کل سے اگر ایسی غلطی کر دوں تو جو کدھو کے بیل کی سزا وہ میری سزا۔"

"موچی، قصائی اور رکشے والوں کی صحبت میں تمہارا اخلاق اور زبان سب تباہ ہو رہا ہے۔" منصور نے کہا۔ "صحیح لفظ میٹنی ہے۔ اس کے معنی ہیں۔ دوپہر۔ سمجھے!"

"اچھا جی!" اس نے خوشامدیوں کی طرح دانت نکالے۔ اور جیسے کہ اب جان میں جان آئی ہو۔ ایک طرف جا بیٹھا۔

نجمہ کھانا لائیں۔ پھر اس نے بے چارگی سے چائے کی فرمائش کی۔ وہ بھی بنا لائیں۔ رات کے پونے بارہ بجے جب منصور نے گردن میں ہاتھ دیکر اسے کمرے سے نکالا ہے تو سارے گھر میں سناٹا پڑا تھا۔ افتخار صاحب بھی غالباً سو چکے تھے۔ چند لمحے وہ کھڑا سُن گُن لیتا رہا اور پھر پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

دوسرے روز گھر میں جانے کس تقریب کی تیاری تھی کہ ہشام کی کھال کے ادھیڑنے کا پروگرام کسی اور موقعہ کے لئے اٹھا رکھا گیا!۔ اور وہ خود بھی نیک ہونہار اور سعادت آثار بنا سب کے سامنے ہی سامنے ناچتا رہا!

گھر میں سفیدی ہو رہی تھی۔ صفائی ہو رہی تھی۔ مزدور کام کر رہے

تھے بڑی اکھاڑ پچھاڑ مچی تھی۔ لیکن میں ہشام کا سامنا سامرہ سے نہ ہوا۔ وہ اب بھی گم صم اور ندامت زدہ سی تھی۔ فیروزی رنگ کے ملگجے لباس میں بیٹھی عجیب سی سوگوار لگ رہی تھی۔ بال بکھرے ہوئے۔ چہرہ اُترا ہوا۔ اس پر جو انقلاب گزرا تھا وہ بہت پائیدار اثرات چھوڑ گیا تھا!

اس نے ہشام کو دیکھا۔ کیسا تر و تازہ۔ شگفتہ، ہشاش بشاش لگ رہا تھا اچھا خاصہ موٹا تازہ تو وہ تھا ہی۔ اس وقت بڑے پائنچوں کے پاجامے اور سفید ڈھیلے ڈھالے کرتے میں تو زیادہ تندرست اور عمر سے بڑا لگ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر ایسی مسکراہٹ تھی کہ سامرہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی!

اس نے نہایت نفرت سے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور بُوا سے بولی۔

"دے دیجئے مجھے رات کے باسی دو کباب اور دو پھلکے۔ یہی بہت ہے۔ اب تو بس مکھن اُبلے ہوئے انڈے اور جیلی ویلی کے نخرے مجھے نہیں بھاتے۔ کچھ دیر بعد رمضانی کے ہاتھ سے چائے البتہ بھجوا دیجئے گا!" وہ بوا کے ہاتھ سے اپنا ناشتہ لے کر چلی گئی۔

"یہ ہو کیا رہا ہے۔ نانی اماں" اس نے بُوا سے پوچھا "میرے آپ کے بیاہ کی تیاریاں تو نہیں ہیں کہیں؟"

نانی اگرچہ ستّر کے لگ بھگ تھیں۔ مگر اس مذاق کو ہمیشہ سنجیدگی سے لیتی تھیں۔ بُرا مان کر بولیں "ہاں اور کیا۔ اسی لئے تو پیروں پہ ڈال کر نہلایا دھلایا۔ سینے پہ لٹا کر سلایا۔ اور بڑا کرتے ہیں نگوڑے بال پکا لئے کہ اللہ رکھے تم جوان ہو گے تو تمہی سے بیاہ رچاؤں گی" وہ روٹی بیلتی ہوئی بولیں "بیاہ تو خدا کے فضل سے ہوگا ضرور۔ تمہارا نہ ہی۔ بٹیا کا ہی۔ کل تو میاں بڑی بٹیا کا چلّہ ہے۔ شام کو دعوت ہے۔ کوئی صاحب

ہیں وہ سامرہ بٹیا کا رشتہ لا رہے ہیں۔ ان کی دعوت ہوگی!" یہ ساری دھوم دھاڑ اللہ رکھے اسی کی ہے۔"

"اچھا اچھا۔ سامرہ بٹیا کا رشتہ آرہا ہے۔ مبارک مبارک۔ لائیے اس خوشی میں گرما گرم ناشتہ اور کیا نام کافی۔" وہ بے حد خوش ہو گیا۔

دو دن بڑے مصروفیت کے گزرے! دوسرے دن ماہرہ کا چلّہ ہوا۔ چھوٹی موٹی تقریب تھی۔ ہنگامہ تھا۔ سب مگن تھے۔ اور اس رات ہشام پھر مغرب سے جو غائب ہوا تو بدستور دس بجے رات کو واپس آیا۔ لیکن ہوا یہ کہ دن بھر کے ہنگامے سے تھک کر سب آرام کر رہے تھے۔ کسی نے اس کی خبر نہ لی۔ وہ چپکے سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

تیسرے روز جیسے بے موسم عید آئی تھی۔

صبح ہی سے دعوت کا سامان ہونے لگا! منصور جا کے اپنے چانسلر صاحب سے مل کے ان کی خدمت میں اپنے والد صاحب کا خط پہونچا آئے تھے۔ اور انہوں نے افتخار صاحب کی دعوت قبول کر لی تھی۔ بیگم افتخار بہت مسرور تھیں۔ اور نہایت خوش خوش دعوت کی تیاری میں اِدھر اُدھر پھر رہی تھیں!

پانچ بجتے بجتے انہوں نے سب انتظام مکمل کر لیا۔ اور ہشام کو بھی الٹی میٹم مل گیا کہ لڑکوں کے ساتھ اسے بھی مہمانوں کو "سرو" کرنا ہے۔ لہٰذا اگر آج وہ باہر گیا تو قطعی اس کی ٹانگیں توڑ ڈالی جائیں گی!"

"نن۔ نہیں" وہ گھبرا کر ہکلایا "میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ ٹانگیں ٹوٹنے کا دردناک منظر مجھ سے نہ دیکھا جائے گا!"

پانچ بجے شام کو گھر کے سب مرد باہر ڈرائنگ روم کے سامنے قرینے سے

بچھی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ چوکیدار نے پورا پھاٹک کھول دیا۔ اور پتھر کے بُت کی طرح اپنے اسٹول پر اٹین شن ہو بیٹھا۔

غنیمت تھا کہ مطلع صاف تھا۔ البتہ چھوٹے چھوٹے سفید بادلوں کے گالے ہواؤں کے دوش پر اُڑے جا رہے تھے اور بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ باغ کا منظر بھی بے حد دلکش ہو گیا تھا۔ ہری ہری دُوب پر جگہ جگہ رنگیں پھولوں کے پودے تھے اور بہت خوشنما معلوم ہو رہے تھے۔ بیچ میں شفاف چمکیلی روش تھی۔ وہ جاتی ہوئی دھوپ کے عکس میں چمکتی بے حد شاندار لگ رہی تھی!

افتخار صاحب نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ سوا پانچ ہو رہے ہیں۔

"فرض کیجئے کہ اگر وہ صاحب کوئی پیغام لے بھی آئے تو کیا آپ واقعی لڑکی کو بیاہ دیں گے؟" اصغر صاحب نے پوچھا۔

عجیب ضد ہے بھئی بیگم کی بھی۔ افتخار صاحب نے آواز دبا کر کہا۔ رات پھر اسی بحث میں الجھی رہیں۔ ان کا تقاضہ شدید ہے۔ اچھا ہے اس الجھن سے نجات ملے۔ شادی تو اس کی کرنی ہی ہے آج نہ سہی کل سہی۔ پتہ نہیں وہ کون اُلّو کا پٹھا تھا۔ جس نے سارہ سے مل کے یہ پہاڑ ڈھایا۔ بے چاری بچی مزے میں پڑھ رہی تھی۔ لاحول ولا قوۃ!

دفعتہ سڑک پر ایک کار نظر آئی اور وہ اسی پھاٹک میں مڑ گئی۔ سب یکبارگی اٹھ کھڑے ہوئے اور لپک کر زینے سے اتر کر روش کے کنارے آ کھڑے ہوئے۔ چوکیدار لپکا۔ کار کے رکتے ہی پٹ کھولا۔ منصور نے بڑے ادب سے جھک کر تقدیم کی اور بڑی تمکنت اور شان سے وائس چانسلر صاحب اوپر ڈرائنگ روم میں تشریف لائے۔ منصور نے تعارف

کرا:

سب اطمینان سے بیٹھ کر مختلف باتیں کرنے لگے۔ ملکی سیاست، بڑھتی ہوئی گراوٹ۔ آج کل کی تعلیم کا گرتا ہوا معیار! طلباء میں تعلیم سے دلچسپی کا فقدان اور متلاشیان روزگار کا ملک سے باہر جانے کا رجحان۔ غرض یہ کہ کوئی مبحث ایسا نہ تھا کہ جس پر ان سب میں تنقید و تبصرہ نہ ہوا ہو۔

چانسلر صاحب بڑے زندہ دل، خوش مزاج اور بے تکلف ثابت ہوئے۔ یوں سب میں گھل مل گئے جیسے ان سب سے بہت دِنوں کی جان پہچان ہو۔ بات بات پر زندگی سے معمور اونچے اونچے قہقہے۔ لطیفے، الغرض ان لوگوں نے چانسلر صاحب کو بے حد پسند کیا تو چانسلر صاحب بھی ان لوگوں سے ملکر خاصے مسرور لگ رہے تھے۔

پھر اسی دوران میں ملازمین چائے لے آئے!۔ اور چائے کی میز پر اصلی موضوع چھڑ گیا!۔

جی ہاں!۔ انہوں نے بڑی فراخدلی سے فروٹ کیک کا پورا پیس اٹھا کر کھاتے ہوئے کہا۔ مجھ سے جناب سید صاحب نے تذکرہ کیا تھا۔ اور۔

اس موقعہ پر بھوپھا ابا خاصے بھونچکا دکھائی دئے۔ اور اپنی گھبراہٹ پر چھپانے کے لئے جلدی جلدی پیسٹری سے انصاف کرنے لگے!۔

میری نگاہوں سے بہت سے اچھے اچھے طلباء گذرے ہیں۔

چانسلر صاحب نے کہا۔ کئی تو ایسے عمدہ اخلاق و صورت کے تھے کہ میرا دل بے اختیار چاہتا تھا انہیں اپنا داماد بنالوں۔ مگر افسوس کہ میری کوئی لڑکی نہیں۔

یہ کہہ کر انہوں نے بڑا سا قہقہہ فضا میں لڑھکا یا!۔

خیر جناب۔ یہ بچی بھی تو آپ ہی کی ہے" ابصار صاحب نے کہا "
بے شک، بے شک" انہوں نے کہا" ذرا بھنے ہوئے کاجو کی پلیٹ ادھر سرکائیے۔ مجھے یہ کاجو بہت پسند ہیں۔ گھر جاتے ہوئے کئی پیکٹ خرید کر لے جاتا ہوں۔ شکریہ۔ ہاں صاحب۔ یہ بچی بھی میری بچی ہے اور وہ بچہ بھی گویا میرا ہی ہے!"

جی۔!" افتخار صاحب بولے"

" آپ نے اسم نویسی کا مطالبہ فرمایا تھا" وہ بولے" چنانچہ میں لے آیا ہوں لیکن بس کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ کو میرا اعتماد کرنا چاہیئے۔ جب میں کسی لڑکے کی سفارش کرتا ہوں تو اس کی نسبت کسی غلط فہمی کو دل میں جگہ دینا ممکن نہیں۔ جناب۔ لڑکا تعلیم یافتہ، ہونہار، شریف، اور اعلیٰ خاندان سے منسلک ہے۔ فی الحال برسر روزگار نہیں ہوا ہے۔ مگر اس کی تعلیمی اٹھان کو دیکھتے ہوئے یہ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ عنقریب ایک عمدہ ملازمت خود ہاتھ باندھے اس کی خدمت میں حاضر ہو جائے گی!۔ چائے میں کیا دیر ہے؟"
" جناب والا۔ یہ کرسی نفس آپ نے چھوئے بھی نہیں!" ابصار صاحب نے کہا"

آپ کا ارادہ غالباً مجھے رات کے کھانے پر بھی ٹھہرانے کا ہے؟" چانسلر صاحب نے کہا جو توقع کے خلاف خوشمزاج بے تکلف اور کچھ بے حد اپنے سے ہوئے جا رہے تھے!"

" جی ہاں!" ہماری خوشی اسی میں ہے کہ جناب آج دال روٹی غریب خانے پر ہی تناول فرمائیں!" افتخار صاحب نے انکساری سے کہا"
" حضور، دال روٹی تناول نہیں فرمائی جاتی۔ صرف کھائی جاتی ہے۔

تناول تو فرمایا جاتا ہے۔ پلاؤ۔ مرغ، مزعفر، اور جانے کیا کیا؛ وہ زور سے ہنستے ہوئے بولے: "اگر دال روٹی ہی ہے تو اجازت دیجئے۔ یہ تو گھر پر بھی کھا لیتا ہوں۔ میں تو کچھ بڑھیا سے کھانے تناول فرمانے آگیا تھا۔"

"تو آپ مرغ پلاؤ۔ مرغ قورمہ، کوفتے، ہی تناول فرمایئے گا۔"

ابصار صاحب نے کہا: "آپ کے طفیل ہم بھی چکھ لیں گے۔ ورنہ دال روٹی تو ہماری بھی روز ہی کی ہے۔"

بھاری قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا۔ اخلاقاً منصور، ایثار نے بھی دانت چمکا دیے اے۔

ہشام!" افتخار صاحب نے اسے آواز دی۔ شروع ہی سے بٹلروں کے ساتھ بٹلر بنا کمرے میں حاضر تھا۔

"جی!" وہ ننگے پاؤں قالین پر بھاگتا ہوا آیا۔

اندر پوچھو۔ چائے میں کیا دیر ہے؟"

"لے آؤں؟"

ہاں۔"

چنانچہ چائے کے بعد وہ سب پھر صوفوں پر آبیٹھے۔ چانسلر صاحب نے اپنا کوٹ اتار کے صوفہ کی پشت پر ڈال دیا سر اٹھا کر سیلنگ فین کو دیکھتے ہوئے بولے:

"بیٹے۔ اسے چلا دو!"

ایثار نے آگے بڑھ کر پنکھا آن کر دیا۔

چانسلر صاحب نے پتلون کی جیب سے ایک کاغذ نکال کر افتخار صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے تھوڑا سا اٹھ کے ادب سے نامہ لے کے ہاتھ سے

لے لیا۔ اور ابصار صاحب کی طرف سرکا دیا۔

"دیکھو!"

نسب نامہ پر نظر پڑی تو وہ ایک منٹ کے لئے چونکے۔

اسم نوشہ۔ سید محمد ہشام۔

لیکن دوسرے لمحے ان کی نظریں نوشہ کی ڈگریوں پر پڑیں۔ جہاں لکھا تھا۔

بی کام فرسٹ ڈویژن میرٹ ہولڈر،

ایل ایل بی۔ جاری۔ تیسرا سال"

افتخار صاحب نے آگے پڑھنا شروع کیا۔ مگر ابصار صاحب نے سینے کی گہرائی سے ٹھنڈی سانس لی۔ اور وہ کچھ افسردہ دل سے ہو گئے۔

کیا تماشہ تھا۔ ایک یہ خوش نصیب ماں باپ کا بیٹا ہے۔ اور ایک وہ بدنصیب ماں باپ ہیں۔ ان کا بیٹا بھی اسی خوش نصیب کا ہم نام ہے مگر اس سے کتنا مختلف، افسوس۔ افسوس۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ہشام ایک طرف کھڑا تھا۔ چہرے پر احمقانہ مسرت کی پرچھائیاں خواہ مخواہ کی مسکراہٹ ہونٹوں پر۔ معمولی سے کپڑے۔ ننگے پاؤں۔ کم بخت نے قالین کے احترام میں چپلیں نہ پہنی تھیں۔ جاہل مطلق۔ نامراد۔ ابصار صاحب کا دل چاہنے لگا۔ ڈنڈا لے کر پل پڑیں۔ پھر شدید ترین غصہ ضبط کر کے وہ افتخار صاحب کے ہاتھ سے اسم نویسی پر نظریں دوڑانے لگے!"

پتہ نہیں افتخار صاحب اور چانسلر صاحب کیا باتیں کر رہے تھے۔ مارے غصے کے ان کے حواس خمسہ ہی ماؤف ہو گئے تھے!"

افتخار صاحب نے منصور کو اسم نویسی دی کہ اندر دے آئیں!"

رات کے پر تکلّف کھانے کے بعد چانسلر صاحب انہیں بہت بہت اُمید دلاتے رخصت ہوئے!"

اندر سے فرمائش کہ خواتین لڑکے کو بھی دیکھنا چاہتی ہیں "

جاتے جاتے چانسلر صاحب نے کہا" ہاں ہاں ضرور۔ لڑکا بھی آجائے گا اور لڑکے کے والد سے بھی ملا دوں گا۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ آپ اِن سے مِل کر خوش ہوں گے۔ مگر فی الحال صاحبزادے کے والد بزنس کے سلسلے میں کہیں گئے ہوئے ہیں۔

جب بھی آئیں گے۔ کہلوا دوں گا۔ یہی ٹھیک ہے۔ لڑکے اور لڑکی کے والد آپس میں بات چیت کر لیں!"

ان کے جانے کے بعد جب سب لوگ مِل کر بیٹھے تو خوب ہڑبونگ مچی۔ بیگم افتخار کی رائے تھی کہ ایسے عمدہ رشتے کو چھوڑنا نہیں چاہیئے! جلد سے جلد لڑکے کے باپ سے مِل کر بات پکی کر لینی چاہیئے۔ اچھے لڑکے عنقا ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں کوئی دوسرا اچک لے!"

افتخار صاحب کچھ اداس سے تھے۔ بولے "

ہاں کر لیں گے۔ بات وات بھی۔ پہلے اس کے باپ یہاں آئیں تو۔ بزنس کے سلسلے میں کہیں گئے ہیں!"

پھر ایک خوفناک حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ سامنے ہشام بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ایثار کا بچہ ابرار بھی بیٹھا ہوا بڑے شوق و دلچسپی سے ہشام کو گلی بناتے دیکھ رہا تھا۔

اور ہشام لکڑی کے ایک ٹکڑے کو چاقو سے چھیل کر گلی بنا رہا تھا!۔

"دو لکڑیاں لے آؤ۔ پھر میں تم کو گلی ڈنڈا کھیلنا سکھا دوں"

ہشام نے ابّی سے کہا اور بس قیامت سی آگئی۔ ابصار صاحب جو دیر سے ضبط کئے بیٹھے تھے۔ اپنا پہاڑی جوتا لے کر جھپٹے۔ چیخ کر بولے۔

"مردود۔ نابنجار، ابے تو خود تو کسی مرض کی دوا نہیں ہے ساتھ ہی اُسے بھی خراب کر رہا ہے۔ آج میں تجھے مار ڈالوں گا۔ نا شُدنی۔ تیری صورت سے مجھے نفرت لگ رہی ہے۔ آج تو میں تجھے دفن ہی کر دوں گا:

ڈیڈی!" ہشام کے ہاتھ سے چاقو گر گیا اور وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

اُدھر سے ایثار اور منصور نے جھپٹ کر ابصار صاحب کو تھام لیا۔ افتخار صاحب چیخے:

"ابصار۔ یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

ابصار صاحب پر جنون طاری تھا۔ ان کے دھاڑتے ہوئے غصے میں بے بسی کے آنسوؤں کی لرزش بھی شامل ہو گئی تھی:

"بھائی صاحب!۔ اب مجھے مت روکیئے۔ اسے جان سے مار کر میں پھانسی پر چڑھ جاؤں گا۔ یہ بھی تماشا ہو۔ میں بھی ہر وقت کی جان کنی سے بچ جاؤں۔ خدا کی قسم۔ میرا جگر داغدار ہے۔ آج میرے صبر کی انتہا ہو گئی ہے۔ بھائی صاحب:

ایک وہ باپ ہے جس کا بیٹا اسی منحوس بدذات ذلیل جاہل کا ہمنام ہے۔ وہ پڑھا لکھا ہے۔ ہونہار ہے۔ آگے چل کر بڑا آدمی بنے گا۔ اور یہ بے حیا بے غیرت گنوار اُسی کا ہمنام ہے۔ یہ کیا کرے گا۔ یہ حرام خور لٹھ رکشا چلائے گا۔ ٹھیلہ ڈھکیلے گا۔ بھیک مانگے گا۔ خیرات پر جئے گا:

نہیں۔ میں اس کی تمہاری بربادی نہیں دیکھ سکتا۔ آج میں اس بدبخت کا تختہ ہی سیدھا کر دوں گا۔ منصور، ایشا چھوڑ دو مجھے۔ میں اس گوشت کے بیکار پہاڑ کو زمین کے برابر کر دوں "

بیگم ابصار زار زار رو رہی تھیں۔ ان کے دل کے چھالے ابھی پھوٹ گئے تھے۔ اور سب سکتے میں بیٹھے تھے! "

ہشام الگ تھلگ سر جھکائے کھڑا تھا "

ابصار صاحب چیختے چیختے اچانک رو پڑے "

چلو تم میرے ساتھ آؤ!" افتخار صاحب بھائی کا بازو پکڑ کے انہیں اپنے ساتھ لے گئے "

" اگر وہ کم بخت پڑھا لکھا کسی قابل ہوتا تو سارہ آج میری بہو بنتی "

ابصار صاحب کے منہ سے نکلا "

بنا لو اسے اپنی بہو بنا لو۔ ابصار، افتخار صاحب نے کہا " مجھے بھی اس خلفشار سے نجات ملے کہ بے چاری کو کیسا گھر ملے۔ کیسا شوہر ملے۔ ہشام لاکھ جاہل ہو تو کیا۔ میرا بچہ ہے۔ مجھے اطمینان رہے گا میں اس کی گزر بسر کے لئے مستقل جائیداد کا بندوبست کر دوں گا۔ تم اپنا دل مت دکھاؤ۔ میں بیگم کو بھی سمجھا دوں گا۔ تمہاری خواہش ہے تو تم آج ہی شام کو ہشام اور سارہ کا نکاح پڑھوا دو! "

نہیں بھائی صاحب نہیں!" ابصار صاحب نے گلوگیر آواز میں جواب دیا "

یہ بھائی آپ کی خواہش اور مرضی کی بات نہیں ہے۔ یہ سارہ بیچاری بچی کی مرضی اور اس کے مستقبل کا سوال ہے۔ وہ یقیناً جاہل مطلق گنوار

اُن پڑھ بے روزگار شوہر کو پسند کرے گی۔ اس کے ساتھ خوش نہ رہ سکے گی۔ اُسے اپنے ہم چشموں سے نظریں ملاتے شرم آئے گی۔ ہمیشہ کمتری کا سوہان روح احساس اسے ستاتا رہے گا۔ اور۔ یہ بدبخت۔ یہ کس منہ سے ایک قابل قدر لڑکی کو بحیثیت بیوی کے قبول کر سکے گا۔! نہیں بھائی صاحب یہ تو ہو ہی نہیں سکتا!۔ آپ بھابی سے بات مت کیجئے۔ اگر وہ رضامند ہو بھی گئیں تو میں رضامند نہیں ہوں۔ آپ چانسلر صاحب کے مرسلہ رشتے پر غور فرمائیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس نابکار ذلیل کے ہمنام پر مجھے رشک آیا اور میں آپے سے باہر ہو گیا۔ کاش۔ یہ بھی سیاہ بخت منحوس کسی شریف کا ہوتا!۔ اللہ اللہ!"

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گئے!"

افتخار صاحب کو بھی بے حد صدمہ تھا۔ ہشام نے اپنی بے خبری میں عمر گنوا دی۔ وقت گنوا دیا۔ اب سوائے پچھتاووں کے اس کے پاس کیا ہے؟"

دو ایک دن بعد چانسلر صاحب نے کہا کہ محمد ہشام کے والد صاحب ابوالخیر کشفی افتخار صاحب سے ملنا چاہتے ہیں"

چنانچہ بیگم نے پھر دعوت کا انتظام کر دیا"

لیکن انہوں نے وعدہ خلافی کی۔ دعوت دھری رہ گئی۔ انہوں نے معذرت کہلا بھیجی کہ ضروری کام سے ارجنٹ بمبئی جانا پڑا"

ماہرہ کو میکے آئے بہت دن ہو چکے تھے۔ چنانچہ وہ ارشاد احمد کے ساتھ بچوں سمیت اپنے گھر سدھاریں۔ یہاں بڑا سناٹا چھا گیا۔ اب نہ بچوں کی کلکاریاں تھیں نہ ماہرہ کا پُر محبت وجود!"

نجمہ بھی اکیلی ہو چکی تھی۔ ساحرہ نے ماہرہ کے جانے کے بعد بھابی کے گھر سے جی

اپنا اڈا بھی بنا لیا۔ بے چاری بہت پژمردہ رہنے لگی تھی!!!

ابھی سائرہ کے رشتے کا ہنگامہ اختتام کو نہیں پہونچا تھا کہ بیگم افتخار کی بے چینی کو اور شہ ملی۔ پتہ چلا کہ ان کی بہن نعیمہ اپنی لڑکی مسحور کو لے کر پونہ چلی گئی ہیں۔ وہاں انہوں نے کوئی پیغام پختہ کر رکھا تھا!۔ ان کا ارادہ تھا کہ مسحور کو اب سسرال کا کرہی کے حیدر آباد واپس آئیں گی!! اس خبر نے قدرتی طور پر پھوپھی اور بیگم افتخار پر بڑا اطمانیت بخش اثر چھوڑا ہشام نے بھی سکھ کی سانس لی۔ وہ متوحش رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو مسحور اپنی کسی حماقت سے اس کا گلا کٹوا دے!!

اب ایک بار پھر وہ چھلا چھلایا گبرو یعنی ہر قسم کے غم سے آزاد پہلے کا سا بے فکر بن کر رہ گیا۔ اس ذلت کو بھی لاپروائی سے پیشانی پر سے کھرچ کے پھینک دیا جب والد صاحب اس پر جوتا لیکر دوڑے تھے!!

مگر سائرہ کی جان عذاب میں تھی۔ وہ نجمہ کے پاس رہتی۔ ماں کے حسب الحکم اب نہایت مستعدی اور جگر کاوی سے سوزن کاری سیکھنے لگی تھی۔

اس سلسلے میں اسے نجمہ کی مدد درکار ہوتی وہ سکھاتی تھیں اور ان کے کمرے میں ہر وقت بے تکلفانہ انداز میں ہشام بھی چلا آتا تھا۔ سائرہ کو سخت حیرت تھی۔ ایک وہ تھی کہ ان کی ایک خشم ناک نگاہ نے اس کا طرز حیات بدل کر رکھ دیا تھا۔ اور ایک وہ بھی دن تھا کہ ابصار صاحب نے نہ کہنے والی باتیں بھی کہہ دی تھیں!!

جان سے مار ڈالنے پر تل گئے تھے۔ لیکن اُس پر کسی قسم کا کوئی اثر نہ تھا۔ پہلے کی طرح ہنستا بولتا اور چھین جھپٹ کر کھاتا پیتا تھا۔ ننھے بچوں کی طرح اچھل کود مچاتا تھا۔ ٹی۔ وی میں آنکھیں پھوڑتا تھا۔ اور ہر طرح بے فکر تھا!"

اس کے بارے میں سب نے ایک حتمی رائے قائم کر لی تھی کہ اس کے دماغ کا وہ پرزہ جو صلاحیت کو قبول کرتا ہے۔ غائب تھا! لہٰذا ایسے چکنے پتھر سے سر پھوڑ کر اپنی دماغی صلاحیتوں کو بیکار کرنا محض حماقت تھی۔ لہٰذا اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا"

اکثر سائرہ سے اس کی جھڑپ ہو جاتی!"

"تمہیں تو میرے نام ہی سے شکایت ہوتی تھی" ایک دن وہ سائرہ سے اُلجھ پڑا" اب دیکھو کہ پاک پروردگار نے میری دشمنی کی کیسی سزا دی ہے۔ میرے ہم نام نگوڑمارے چوبیس گھنٹے کھوپڑی پر سوار رہیں گے۔ انہیں کیسے برداشت کرو گی۔ مراد جلے مردے لکنے کمینے کو میرا ہی نام ملا تھا۔ نحس پھٹا پڑے اس کی صورت پر!"

بھابی ذرا ان کی زبان دیکھئے۔ لوانا نی ہو گئے ہیں بالکل" سائرہ بولی"

"تم نے اپنے نام کی رجسٹری کر والی ہے کیا" نجمہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا"

ایک نام ہے بس۔ کوئی بھی رکھ سکتا ہے!" اور اب یہ کوسا کاٹی نہ کرنا۔ سمجھے۔ خبردار!"

"میں تو ان صاحبزادے سے کہوں گا کہ میاں ایسا ہی شوق ہے تو اپنا اسم گرامی حجام رکھ لیں۔ ہم قافیہ بھی ہے۔ اور تمہارا پیشہ بھی لڑکی والوں

کی حجامت کرنا ہے۔ خوب فٹ بیٹھے گا!" وہ بولا۔

"آپ خود حجام۔ بلکہ نائی!" سائرہ پھٹ پڑی۔

"ہائے اللہ۔ میری توبہ۔ بیوی تم کو کتنا بُرا لگا" اس نے ہاتھ نچا کر یوں کہا کہ نجمہ اس پر پنکھے کی ڈنڈی تان کر کھڑی ہو گئیں اور سائرہ زیر لب گالیاں کوسنے بکنے لگی!"

"تم کو کچھ شرم تو آتی نہیں" نجمہ نے پٹاخ سے ایک ڈنڈی اس کی پیٹھ پر جما کر کہا: "تمہارا ہم نام ہے مگر کتنا قابل ہے۔ اتنا اونچا پڑھا لکھا۔ لائق، معقول، کل کو بڑی ملازمت اسے ملے گی۔ ذرا شرماؤ اس سے"

"میں اس سالے کو جوتی کی نوک پر مارتا ہوں"

تیسرے دن پھر غلغلہ اٹھا کہ ابوالخیر کشفی صاحب تشریف لانے والے ہیں۔ دعوت کا انتظام پھر ہوا۔ اور اس روز وہ پھر دغا دے گئے۔ اب تو سب کا ماتھا ٹھنکا۔

"جانے جی کا یہ کیا کھیل کھیل رہے ہیں کشفی صاحب" بیگم افتخار خفا ہو گئیں۔

"خواہ مخواہ ہمارا وقت بھی خراب کیا" ابصار صاحب بھی بگڑے "ایک دفعہ اور چانسلر صاحب کو بلاؤ یا پھر ان سے جا کے ملو۔ یہ کیا تماشہ ہے؟" بیگم ابصار نے کہا۔

"وہ تو خود کوئی مذاق نہیں کر رہے ہیں" ننھی بھی نے کہا: "میں نے اسی روز پروفیسر کی آڑ سے سنا۔ ہار کے وہ قہقہہ لگا رہے تھے کہ توبہ ہی بھلی"

"یہ ان کی عادت ہے ننھی" منصور نے مسکرا کر کہا: "بہت زیادہ

دلچسپ اور لطیفہ پسند آدمی ہیں۔ کوئی عمدہ لطیفہ یاد آجاتا ہے سنانے کے لئے کوئی پاس نہیں ہوتا تو یاد کر کر کے آپ ہی آپ ہنستے ہیں!"

"آج پھر ان سے ملو" افتخار صاحب نے بیوی کے برہم چہرے پر نظر ڈال کر منصور سے کہا "ایک جواب دیں۔ آخر اس تماشے میں ہمارا کتنا وقت برباد ہو رہا ہے!"

"اچھا۔ ڈیڈی۔ آج آفس سے واپسی پر ان کے دولت خانے پر جاؤں گا۔ اور ایک جواب لے آؤں گا!" منصور نے کہا۔

اس عرصہ میں بیگم افتخار نے سارہ کا پورا جہیز تیار کر لیا تھا۔ اپنے رکھے ہوئے زیور بعض اجلوائے تھے۔ بعض کو نئے سرے سے بنانے کا آرڈر دیا تھا۔ انیس جوڑے کپڑے بھی تیار تھے۔ صرف ایک کام فرنیچر کی خریداری کا تھا۔ وہ تاریخ کے طے ہوتے ہی خرید لاتیں۔ اس آنکھ مچولی سے ان کا دل کچھ کھٹا ہو گیا۔ پھر بھی ناامید نہیں تھیں۔ چانسلر صاحب جیسے سن رسیدہ مہذب انسان کوئی گھٹیا مذاق نہیں کر سکتے۔

شام کو منصور جواب لائے کہ کل شام چائے پر صاحبزادے ہشام اور ان کے والد ماجد مولانا ابوالخیر کشفی صاحب ضرور تشریف لا رہے ہیں۔

"لڑکا بھی ساتھ میں آ رہا ہے؟" فرطِ مسرت سے بے تاب ہو کر بیگم نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ چانسلر صاحب نے فرمایا تو یہی ہے۔ بہرحال اب کل ہی سب کچھ طے ہو جائے گا۔ کیونکہ کشفی صاحب کو تو بزنس کے سلسلہ میں پھر جانا ہے۔

اور وہ پھر جلد ہی واپس نہ آ سکیں گے" منصور نے کہا۔

لفافہ

"کیا بزنس ہے؟" ابصار صاحب نے پوچھا۔

"یہ میں نے نہیں پوچھا۔ چھوٹے چچا۔ اب آپ حضرات ان سے دریافت کر لیجئے گا!" منصور نے جواب دیا۔

"پھر ایک پر تکلف دعوت کا انتظام کر دیا گیا!"

اچانک نجمہ نے پوچھا "ارے ہمی۔ کیا کشفی صاحب کی بیوی نہیں ہیں؟ ان سے نہیں ملیں گی آپ؟ کبھی انہیں بھی تو بلائیے۔ ان کی بات چیت سنی جائے۔ آخر کو سب سے زیادہ سابقہ ساجدہ کو انہی سے رہے گا!"

"پہلے یہ بات چیت تو ہو لے" بیگم افتخار بیزاری سے بولیں "پھر بلوایئے گے بیوی کو بھی"

"مجھے تو دال میں کچھ کالا لگتا ہے" پھوپھی بولیں۔

"بگھار ہو گا" پھوپھا نے لقمہ دیا۔

اتنے میں پتہ چلا کہ چانسلر صاحب کی کار آئی۔ سب پھر تقدیم کو تھیے مگر اس مرتبہ پھر انہیں اکیلے دیکھ کر یہ یقین پختہ ہو گیا کہ چانسلر صاحب بڑا سنگین مذاق کر رہے ہیں۔

چنانچہ افتخار صاحب نے پوچھ ہی لیا۔

"جناب محترم۔ آپ تنہا۔ مطلب یہ کہ ــــ"

ایک خوشگوار آہ بھر کے وہ اپنے بھاری بھرکم وجود کو صوفہ پر لڑھکا کے بولے۔

"کیا عرض کیا جائے جناب۔ لڑکے کے والد صاحب سخت غصہ در دماغ ہو گئے ہیں۔ ہزار میں نے خوشامدیں کیں۔ یہاں آنے پر راضی نہیں ہوئے۔"

ایک سناٹا سا ان پر طاری ہو گیا۔

تو آپ کی تشریف آوری کی کوئی توقع باقی نہیں رہ گئی "۔" انصار صاحب نے کہا۔"

اچانک ان کی طرف دیکھ کر چانسلر صاحب نے ایک قہقہہ لگا دیا۔ جو واقعی دل ہی دل میں انصار صاحب کو گراں گزرا۔"

" آپ کیک بسکٹ منگوا لیجئے۔ میں چائے پی کر نہیں آیا۔ سر میں درد سا محسوس ہو رہا ہے۔ چائے وائے پی کر اطمینان سے بتا دوں گا کہ میں آج واقعی صاحبزادی کا نکاح پڑھوا کے رخصت ہوں گا۔ وہ ہنسے " دیکھا آپ نے۔ نکاح کے تعلق سے لفظ رخصت میری زبان سے کیسا برمحل ادا ہوا ہے "۔

نکاح ! " افتخار صاحب سے اب مزید صبر نہ ہوا۔ بول پڑے " معاف کیجئے گا جناب عالی آپ واقعی کوئی مذاق فرما رہے ہیں۔ لیکن عرض یہ ہے کہ میری بیوی جناب والا کے اس مذاق سے محظوظ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ وہ آپ سے پوری توقعات وابستہ کئے بیٹھی ہیں۔ میرے لئے تو جواب دہی مشکل ہو جائے گی ! "

اتنے میں منصور نے ملازموں کو حکم دیا کہ چائے کے لوازمات لے آئیں وہ اپنے قابل تعظیم و احترام استاد سے کسی اوچھے مذاق کی امید نہیں رکھ سکتے مگر ان کے اس رویے سے انگشت بدنداں ضرور تھے "۔

چائے کے دوران انہوں نے بڑی شریر نظروں سے حاضرین کو دیکھ کر کہا "

کیا خیال ہے۔ اب ایک بڑے اور مستقل راز پر سے میں پردہ ہٹا دوں ؟ "

راز۔ کیا مطلب" کئی زبانوں سے نکلا"

"ابھی بتاتا ہوں" انہوں نے کہا' اپنی پیالی منصور کے آگے سرکا دی "بھر دو"

اندر سے ہشام پانوں کا خوبصورت نقرئی خاصدان لے کر آیا۔ اور بس جیسے ایک کاغذی قلعہ بھک سے اڑ گیا۔ چانسلر صاحب نے ہشام سے کہا۔ "میاں ان بزرگوں کو کب تک خلفشار میں مبتلا رکھو گے۔ حد یہ کہ تمہارے مذاق میں میں بھی پوری طرح سن گیا ہوں۔ بھلا بتاؤ۔ میں کسی دوسرے محمد ہشام ابن ابوالخیر گیلانی صاحب کو کہاں سے پیدا کر دوں۔ جبکہ محمد ہشام ابن ابوالعلاء احمد صاحب کا پیغام میں انہیں دے چکا ہوں"

"یا اللہ!"

"کیا مطلب؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں"

"ارے یہ ہشام!؟"

"نہیں۔ نہیں"

کمرہ عجیب حیران کن تعجب خیز آوازوں سے گونج اٹھا۔

"جی ہاں" چانسلر صاحب نے قہقہہ بلند فرمایا "یہی موصوف ہیں۔ عجیب و غریب طبیعت پائی ہے۔ اُدھر اپنے پھوپھا صاحب مدظلہ کو حلق تک بھر کے میرے پاس بھجوایا۔ اور ادھر میرے ہاتھ پاؤں جوڑ کے مجھے منع کیا۔ حقیقت یہ ہے حضرات! یہی ہشام وہ ہونہار لائق اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ خدا لگی بس یہ ہے کہ حد سے زیادہ مذاق پسند ہے۔ اور تحیر میں مبتلا کرنے کا شائق بھی۔ ورنہ کچھ ٹھکانا ہے کہ آج تک آپ

حضرات کو پتہ نہیں چلا۔ یہ بی کام کر چکا ہے اور وکالت کا نصاب پڑھ رہا ہے!"
ہشام کا یہ حال تھا کہ جیسے زمین میں گڑا جا رہا ہو۔ بنا ڈی شرم خود پر
طاری کر رکھی تھی۔ اور سرخ ہو رہا تھا!"

"مم۔ مگر۔ جناب آپ اس کے مذاق میں کیونکر شریک ہو گئے۔
تعجب ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا!" افتخار صاحب بولے:
وہ ہکا بکا تھے۔ حیران تھے۔ متعجب تھے۔ اور بار بار ہشام کو یوں
گھور لیتے تھے جیسے وہ کوئی عجیب الخلقت جانور ہو اور چڑیا گھر سے
چھوٹ کر یہاں آگیا ہو:"

ابصار صاحب کی حالت اور بھی قابلِ دید اور مضحکہ خیز تھی۔ آنکھیں
پھاڑے منہ کھولے دم بخود کبھی چانسلر صاحب کو گھورتے کبھی اپنے ہونہار
صاحبزادے کو۔ جیسے خواب کے عالم میں گم ہو چکے تھے:"

"میں اپنے ہونہار شاگردوں کا دوست ہوں۔ مسٹر ابصار' ان پر
اپنی شخصیت' عہدے اور استادی کا رعب نہیں جتاتا۔ اور پھر یہ بچہ
تو بہت ہی قابلِ قدر ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ مسلسل چار سال سے
ایک لڑکا اپنے میرٹ ہی کے بل بوتے ٹاپ کرتا چلا جا رہا ہے۔ تو اس
سے ملنے کی خواہش قدرتی طور پر پیدا ہوئی۔ میں نے اسے اپنے اجلاس
پر طلب کیا۔ اس کی ہمت افزائی کی۔ اس کو سراہا۔ اس کا حوصلہ بلند
کیا۔ پھر یہ حضرت مجھ سے کچھ کھلے تو پتہ چلا بہت با مذاق' لطیفہ پسند اور
بذلہ سنج واقع ہوئے ہیں۔ ایسے طلباء اور بھی ہیں لیکن ایک خاص واقعہ
نے اس کی قدر و محبت میرے دل میں دو چند کر دی۔ آپ کو غالباً
علم نہیں کہ میں مجرد آدمی ہوں۔ ایک مرتبہ شدید بیمار پڑا تھا۔ تب

دن رات اس نے میری خدمت کی تھی۔
میرے پیر تک دبائے تھے۔
میرے پاس ساری ساری رات جاگا تھا۔"
میرے لئے رویا تھا۔
تب میں نے سوچا کہ یہ ہڑا شاہد ہیرا ہے۔ آپ لوگ اب سمجھے کہ۔ میں کیونکر اس کے ایک معصوم مذاق میں شریک ہوا اور اس کی خواہش پر اسے اختتام کو پہونچایا۔
مسٹر ابصار۔ میں آپ کو بہت بہت مبارکباد دیتا ہوں۔ آپکو ایک قابل، فخر بیٹا نصیب ہوا ہے۔"
مسٹر افتخار آپ کو اعلیٰ درجے کا داماد ملا ہے۔ آپ سب خوش نصیب ہیں۔"
لیجئے جناب، محمد ہشام ابن کشفی صاحب کا معمہ حل ہو گیا۔"
انہوں نے پھر ایک قہقہہ لڑھکا دیا مگر ساتھ ہی آنسو بھی رومال سے پونچھے جو شائد ہنسنے کی وجہ سے ان کی آنکھوں میں آگئے تھے!"
ہشام؟" اچانک افتخار صاحب نے کپکپاتی آواز میں پکارا۔
جی۔ چچا ابا۔" وہ شرما رہا تھا۔"
"بیٹے۔ میرے پاس آؤ۔
میرے گلے لگ جاؤ۔"
وہ پاس آیا۔"
گھٹنوں کے بل جھکا۔"
اور افتخار صاحب کی آغوش میں سر رکھ دیا۔"

تھوڑی دیر بعد اشہر کو بھیجا گیا کہ ماہرہ اور ایثار کو بلا لائے :
انصار صاحب مسکرا رہے تھے ۔ گریہ و تبسم کے سنگم پر تحیر سے اپنے ہونہار بیٹے کو دیکھ رہے تھے یوں لگتا تھا ۔ ہنسنے کے لئے ان کے پاس ہونٹ کم ہیں ۔ ان کا رد نگٹا رونگٹا شکریہ ادا کر رہا تھا :
یہ خبر سن کر خواتین میں ایسی عظیم الشان کھلبلی مچی کہ ہشام بدحواس ہو گیا ۔
باری باری سب اسے چڑیا گھر کے جانور ہی کی طرح دیکھ رہے تھے ۔

اور عجیب طرح کے تحیر و تعجب کا اظہار کر رہے تھے ۔
مگر حقیقتاً ان کی خوشیاں بھی ان سے ضبط نہ ہو رہی تھیں ۔
انہیں گمان تک نہ تھا ۔ راتوں کو فلم کے بہانے نائٹ کالج میں پڑھ کر اس نے بی ۔ کام کیا ۔ اور میٹنی شو دیکھنے کے قصور پہ بڑوں کی ڈانٹیں کھا کر ایل ایل بی کر رہا تھا ! :
سچ مچ وہ عجوبہ تھا ! ۔
جہالت کی مکمل اداکاری کی تھی اس نے ۔ سامرہ نے سب کچھ سن کر دل تھام لیا :
اس وقت وہ بوکھلا کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی ۔ اور بڑھتی ہوئی حیرت سے سب کچھ سن رہی تھی ! :
ہشام وہیں کھڑا تھا ۔
دفعتہً اس نے سر اٹھایا ۔
سامرہ کی نظریں اس سے مل گئیں ۔ ہشام کو بے ساختہ ہنسی آ گئی ۔

شدید ترین بوکھلاہٹوں مبتلا ہو کر اور جھینپ کے سارہ نے بے ارادہ کہا:۔

دھوکے باز ۔

اور پلٹ کر کمرے میں گھس گئی۔

اسے محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی خوشیاں اور مسرتیں دونوں جہان کے پیمانے میں بھی سما نہ سکتی تھیں!!!

ختم شد

طبعزاد ۔ غیر مطبوعہ

عفت موہانی